جامعہ مدنیہ لاہور کا علمی، ادبی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

نگرانِ اعلیٰ :

حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

اِس شُمارے میں

اداریہ	----------	۳
نعت النبی ﷺ	حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ	۷
درسِ حدیث	حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ	۹
قال النبیؐ	مولوی محمد عظیم بلوچستانی	۱۲
کلامِ نفیس	حضرت سید نفیس رقم مدظلہٗ	۱۳
البیضاویؒ	جناب اختر راہی ایم اے	۱۴
اعترافِ تقصیر	جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۱۷

بدل اشتراک : سالانہ سات روپے طلبہ کیلئے پانچ روپے فی پرچہ ۶۵ پیسے

سید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع وناشر نے مکتبۂ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ انوارِ مدینہ، جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

لاہور

مدیر اعزازی
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مدیر معاون
حبیب الرحمن اشرف

جلد : ۲ | صفر ۱۳۹۲ھ ○ اپریل ۱۹۷۲ء | شمارہ : ۱۰

فون
۶۲۹۳۲

ضروری نوٹ

اس پرچہ میں جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل مضمون کی اشاعت کی وجہ سے "اُولٰئِکَ ھُم الراشدون" اور دوسرے قسط وار شائع ہونے والے مضامین کی اگلی اقساط طبع نہ ہو سکیں۔ ——— ادارہ

مرتب
حبیب الرحمن اشرف

جامعہ مدنیہ ○ کریم پارک ○ راوی روڈ ○ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لائقِ تحسین سمجھوتہ

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

۶ مارچ کو جمعیۃ علماء اسلام، نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان ہونے والے سمجھوتہ کو تقریباً تقریباً ملک کے تمام سیاسی اور غیر سیاسی حلقوں میں بنظرِ تحسین دیکھا گیا اور اسے تینوں پارٹیوں کے رہنماؤں کی فراست، ہوشمندی، عالی ظرفی اور حب الوطنی کا آئینہ دار اور ملک کے لیے نیک فال قرار دیا گیا۔

سمجھوتہ ہونے سے پہلے متذکرہ بالا تینوں جماعتوں کی باہمی آویزش و مخاصمت سے پوری قوم سخت تشویش میں مبتلا اور اپنے مستقبل کے بارے میں خوفزدہ تھی۔ ۴ مارچ کو جب ان جماعتوں کے آپس میں مذاکرات کی ابتداء ہوئی تب بھی چین نہ مل سکا، کیونکہ مذاکرات کے کامیاب ہو جانے کا پورا یقین کسی کو بھی نہ تھا۔

چونکہ گذشتہ مارچ کے یحییٰ مجیب مذاکرات کی ناکامی کا افسوسناک انجام پاکستانی قوم کے سامنے تھا اس لیے ان جماعتوں کے مذاکرات کی ناکامی کے تصور سے بھی اس پریشان حال قوم کے ہر فرد کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور ہر شخص کی یہ آرزو تھی کہ یہ مذاکرات کامیابی سے ہمکنار ہوں اور ان کے باہمی اختلافات و چپقلش کا جلد خاتمہ ہو جائے۔

چنانچہ جب مذاکرات کے اختتام پر صدر نے اپنی نشری تقریر میں مذاکرات کی کامیابی، مصالحت اور سمجھوتہ ہو جانے کا مژدہ سنایا تو عوام میں بے پناہ مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے اس سمجھوتہ کا نہایت والہانہ انداز

میں خیر مقدم کیا گیا۔

ہمیں خوشی ہے کہ ان مذاکرات سے تینوں فریقوں میں بہت سے مسائل پر مفاہمت ہو گئی۔ ایک دوسرے کے متعلق موجود غلط فہمیاں دُور ہو گئیں اور تینوں جماعتوں نے وقت کی نزاکت، اور ملک کی سالمیت اور استحکام کے لیے آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے اور امن کو برقرار رکھنے کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ضد، ہٹ دھرمی اور تشدد کے بجائے افہام و تفہیم، دانشمندی اور وسیع النظری کا مظاہرہ کر کے ملک کو خون خرابے اور خطرناک بحران سے دوچار ہونے سے بچا لیا اور عوام کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہُوا۔

ہم تینوں پارٹیوں کے سربراہوں کو اس سزاوارِ تحسین سمجھوتہ پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور آئندہ کے لیے ان سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ملک و ملت کے مفاد کی خاطر اختلافی مسائل ہمیشہ اسی طرح خلوص و فراخدلی اور حب الوطنی کے جذبہ سے طے کیا کریں گے۔

ہماری دعا ہے کہ خدا اس سمجھوتہ کو کامیاب فرمائے اور اسے دوسرے اختلافات کے خاتمے اور حل کے لیے پیش خیمہ ثابت فرمائے۔ آمین

کمینہ دشمن

پچھلے دنوں بھارت میں پاکستانی جنگی قیدیوں کو جس بے دردی سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور ان کیساتھ جو وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کیا گیا۔ دنیا کے ہر انصاف پسند نے اسکی مذمت کی ہے۔

بے بس قیدیوں پر گولیاں چلانا اور انہیں جان سے مارنا کوئی بہادری نہیں، بلکہ پرلے درجے کی بزدلی اور کمینہ پن ہے۔ ہمیں بھارت کی اس مذموم اور غیر انسانی حرکت سے جو تکلیف اور صدمہ پہنچا ہے الفاظ اسکی تعبیر سے قاصر ہیں۔ خداوند کریم ان کے پسماندگان کو صبر و اجر دے اور بھارت کو اس ظلم کے انجام بد سے جلد دوچار کرے۔ اسکی طاقت پارہ پارہ ہو اور سرِ غرور جھک کر رہ جائے۔

خوش آمدید

سابق وزیر اطلاعات جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے لیبیا اور چند دوسرے ممالک کے دورہ سے واپس آ کر بتایا ہے کہ لیبیا کے حکمران کرنل معمر قذافی اپریل میں پاکستان کا دورہ کریں گے

لیبیا پاکستان کا مخلص ترین دوست ہے۔ موجودہ مشکل حالات میں لیبیا نے جس پامردی اور شجاعت سے ہمارا ساتھ دیا ہے وُہ اپنی نظیر آپ ہے۔ پاکستانی عوام کے دلوں میں لیبیا کے موجودہ حکمران کی بڑی ہی قدر و منزلت ہے۔ وہ ایک خود دار اور بہادر، باعزم و جری مسلمان ہیں۔ ان کی ذات میں قدرت نے بہت سی خوبیاں جمع فرمائی ہیں ان کی آمد ہمارے دلوں کے لیے ایک پیام مسرت ہے۔ اور ہم اپنے اس عظیم مجاہد دوست کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔

خدا وہ وقت جلد لائے کہ ہمارے مخلص دوست ہم میں موجود ہوں۔

اس شمارے میں

زیرِ نظر شمارہ میں جنابِ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا وہ اہم اور تاریخی مضمون بھی شاملِ اشاعت ہے جس میں انہوں نے اپنی ان خطاؤں اور ان غلطیوں کی معافی چاہی ہے جو اُن سے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شان میں اُس زمانہ میں سرزد ہوئی تھیں جب وہ مسلم لیگ کے سرگرم اور مخلص کارکن کی حیثیت سے مسلم لیگ کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے۔

یہ مضمون اب سے کوئی چار سال قبل عہدِ ایوبی میں لکھا گیا تھا، لیکن بعض وجوہات کی بناپر اسکی اشاعت معرضِ التوا میں پڑی رہی۔ اب اسے ماہنامہ "میثاق" لاہور کے فروری اور مارچ (۷۲ء) کے شماروں میں طبع کر دیا گیا ہے۔ اور ہم بشکریہ "میثاق" اسے قارئینِ انوارِ مدینہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

بلاریب پروفیسر صاحب پر اللہ تعالیٰ کا یہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ انہیں خلوصِ دل سے توبہ اور رجوع کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی، ورنہ ایسے کتنے ہی لوگ ہوں گے جنہوں نے قطبِ وقت حضرت شیخ العرب والعجم سیدنا و مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ایسی ایسی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچانے کی جسارت کی جو حدِ بیان سے باہر ہیں، لیکن ان کی شومئی قسمت کہ انہیں خدا سے خدا کے اس پاک بندے کی دل آزاری اور ایذا رسانی ایسے عظیم جرم کی معافی طلب کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کُلُّکُمْ خَطَّاءُوْنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ یعنی تم میں سے ہر ایک سے بار بار خطاء کا صدور ہوتا رہتا ہے، لیکن خطاکاروں میں بہترین اور اچھا آدمی وُہ ہے جو (خطاء کے بعد اسپر

نادم ہوکر) باربار طالبِ عفو (بھی) ہو۔

ایک اور حدیث شریف میں توبہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا گیا ہے التائبُ من الذنب کمن لا ذنب له گناہ سے تائب ایسا ہی ہے جیسے کہ اس نے گناہ کا سرے سے ارتکاب ہی نہیں کیا۔

گویا کسی بندے کا اس کے نفس امارہ کی تمام کوششوں اور رکاوٹوں کے علی الرغم اپنی غلطیوں کا اعتراف واقرار اور ان پر ندامت وپشیمانی اور پھر توبہ وانابت جو بلاشبہ غیر معمولی اور دشوار کام ہے' خداوند تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے۔

مختصر یہ کہ توبہ کرنا بہت بڑی سعادت اور حق تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

گرامی قدر پروفیسر صاحب کے اس سعادت سے بہرہ ور ہونے پر ہم انہیں تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خالقِ کائنات ایسے تمام لوگوں کو جنہوں نے حضرت شیخ الاسلامؒ کے متعلق کسی بھی قسم کی گستاخی کا ارتکاب کیا ہے یہ احساس بخشے کہ یہ سنگین جرم ہے جو بہت بڑے عذاب کا سبب بن سکتا ہے۔

کسے معلوم نہیں کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ ایک غیر معمولی اور ملت کی مایۂ ناز شخصیت تھے۔ اس صدی میں زہد وتقویٰ اخلاص وللّٰہیت، جرأت وشجاعت اور تبحرِ علمی کے اعتبار سے وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے اور بلاشبہ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ کی عملی تفسیر تھے۔ دنیا میں ان جیسے اعلیٰ اوصاف سے متصف ہستیاں خال خال ہی رہی ہیں۔ ؏

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ

ایسے فقید المثال بزرگ کی بے ادبی اور گستاخی یقیناً بہت بڑا جرم ہے اس لیے جس جس سے بھی اس عظیم جرم کا صدور ہوا ہے اسے بلا تاخیر حق تعالیٰ سے معافی طلب کر لینی چاہیئے۔

اَفَلَا يَتُوبُونَ اِلَى اللهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهٗ۔ یعنی کیا (یہ جاننے کے باوجود بھی کہ یہ بڑا جرم ہے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے۔ ••

حبیب اللہ غفرلہٗ

۲۹ محرم الحرام

۱۳۹۲

نعت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بقلم استاذنا المکرم مولانا السیّد حامد میاں ادام اللہ معالیہم

خَلِیلَیَّ مَا بَالُ الْمُحِبِّینَ قَدْ طَوَوْا　　حَدِیثَ شُجُونٍ قَبْلَ اَنْ یَّبْرُدَ الْهَوٰی

میرے دائیں بائیں کے جگری دوستو! یہ کیا ہوا؟ کہ اہلِ محبت نے آتشِ عشق سرد ہونے سے پہلے ہی حدیثِ عشق لپیٹ کر رکھ دی۔

حَرِیقٌ بِاَکْبَادٍ تَقَطَّعْنَ مِنْ جَوًی　　بِاَلْحَاظِ اَجْفَانٍ مِّنَ الْبِیْضِ کَالْمَهَا

ان جگروں میں ایک آگ لگی ہوئی ہے جو ہمسرِ غزالاں حسین عورتوں کی آنکھوں کے پردوں میں ترچھی نظروں سے شدتِ عشق میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں

وَلِلْحُبِّ ظَلَّامُ الْعِبَادِ وَرَبِّهٖ　　فَیَسْلُبُ اَرْوَاحًا وَّیَفْعَلُ مَا یَشَا

اور پروردگار محبت کی قسم یقیناً محبت تو لوگوں پر بہت ظلم کرتی ہے کہ جان کھینچ ڈالتی ہے اور جو چاہتی ہے کرتی ہے۔

وَلٰکِنَّ لِیْ یَا صَاحِ دُوْنَ اَغَنِّهَا　　وَاَکْحَلِهَا شُغْلًا بِحِبٍّ تَخَامَرَا

لیکن میرے دوست! مجھے تو ان سرمگیں آنکھوں والیوں اور نازسے گفتگو کرنے والیوں سے ہٹ کر اپنے محبوب سے سروکار ہے جو رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔

فَاَلَتْ جِبَاهُ الْعِشْقِ مِنْ نُوْرِ حُسْنِهٖ　　تُهَرْوِلُ شَوْقًا کَالْفَرَاشِ لِتَسْجُدَا

عشق والوں کی پیشانیاں اس کے نورِ حسن سے (اس کی طرف) لوٹ کر (اس کے حضور جھک جانے کے لیے نہایت تیز قدمی سے چل پڑیں۔

قَرِیْبٌ مِّنَ الْاَحْشَاءِ وَالْقَلْبِ مَنْ غَدَا لَہٗ مَنْزِلٌ فَوْقَ الْکَوَاکِبِ وَالسُّہَا

وہ سینہ اور دل کے قریب ہے کہ جس کا ٹھکانا ستاروں اور سُہا[1] ستارے سے بھی بلند ہے

فَوَاللَّیْلِ اِذْ یَغْشٰی وَوَالشَّمْسِ وَالضُّحٰی وَوَالنَّجْمِ اِذْ یَہْوٰی وَوَالْفَجْرِ اِذَا ضَا

پس رات کی قسم جب وہ ڈھانپ لے اور سورج کی قسم چاشت کی قسم اور تارے کی قسم جب وہ نیچے آئے (غروب ہو) اور فجر کی قسم جب وہ روشنی پھیلائے

لَقَدْ خَرَّ مُوْسٰی دُوْنَ رُؤْیَۃِ رَبِّہٖ وَلَمْ یَزِغِ الْاِبْصَارُ مِنْہُ وَمَا طَغٰی

(کہ) حضرت موسیٰؑ اپنے پروردگار کی رویت کامل سے بیلے ہی بیہوش ہو کر گر پڑے تھے اور ان کی رویت میں (یہ ہوا کہ) نہ نظر ٹیڑھی پڑی نہ (یہ ہوا کہ جہاں پڑنی چاہیے تھی وہاں سے متجاوز ہو کر) آگے پڑی۔

وَوَالطُّوْرِ قَدْ اَدْنَاہُ حَتّٰی کَاَنَّہٗ لَاَدْنٰی مِنَ الْقَابَیْنِ لِلْقَوْسِ اِذْ دَنٰی

اور طور کی قسم حق تعالیٰ نے ان کو قرب عطا فرمایا حتیٰ کہ وہ اتنے نزدیک ہوئے کہ مثال کے لیے فرمایا گیا کہ جیسے (کمان کے دو سروں کے فاصلہ کے برابر تک نزدیک ہو گئے۔[2]

فَہَلْ یَرِدَنْ یَوْمًا مِیَاہَ فُیُوْضِہٖ ضَعِیْفُ سَقَامٍ مُسْتَہَامٌ تَشَتَّتَا

تو کیا ایسا کوئی دن آئے گا کہ ان کے فیوض کی نہروں سے وہ آدمی جو بیماری سے کمزور اور حیران و پراگندہ خاطر ہے سیراب ہو۔

فَیَالَیْتَ کَاسًا مِنْ حَبِیْبٍ لِرُوْحِہٖ اِذَا مَا اَتَاہُ نَائِبًا عَنْہُ مَا اَتٰی

کاش ایسا ہو کہ ایک پیالہ اپنے حبیب سے اس کی روح کو عنایت ہو جائے جب اس (ضعیف) کی نیابت کرتے ہوئے اس کے حضور وہ چیز حاضری دے جو حاضری دیتی ہے۔

"الصدیق" ملتان جمادی الاخریٰ ۱۳۷۲ھ)

---

[1] چھوٹی بنات النعش میں ایک مخفی سا ستارہ ہے، عرب اسے دیکھ کر اپنی تیزیٔ نگاہ کی آزمائش کیا کرتے تھے

[2] اس قسم کے کلمات (قسم کے مشابہ) مضمون کی تاکید کے لیے لائے جاتے ہیں۔ یہ حقیقتاً قسم نہیں ہوتے بلکہ فقط صورۃً قسم ہوتے ہیں

مخدومنا المحترم حضرت مولانا السید حامد میاں مدظلہم

درسِ حدیث

ترتیب : —— برادرِ عزیز حافظ خوشی محمد اعجاز

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ غُلَامًا يَهُوْدِيًّا كَانَ يَخْدُمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَمَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُ فَوَجَدَ اَبَاهُ عِنْدَ رَأْسِهٖ يَقْرَأُ التَّوْرَاةَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا يَهُوْدِيُّ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَجِدُ فِي التَّوْرَاةِ نَعْتِيْ وَصِفَتِيْ وَمَخْرَجِيْ قَالَ لَا. قَالَ الْفَتٰى بَلٰى وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَجِدُ لَكَ فِي التَّوْرَاةِ نَعْتَكَ وَصِفَتَكَ وَمَخْرَجَكَ وَاِنِّيْ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهٖ اَقِيْمُوْا هٰذَا مِنْ عِنْدِ رَأْسِهٖ وَلُوْا اَخَاكُمْ.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا جو جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت کیا کرتا تھا وہ ایک دفعہ بیمار ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ لڑکے کا باپ اُس کے سرہانے بیٹھا تورات پڑھ رہا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس سے فرمایا کہ اے یہودی! میں تمہیں اُس اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں جس نے حضرت موسےٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی کہ تم تورات میں مری نعت مری صفت اور مری ہجرت کا حال پاتے ہو؟ اُس نے جواب دیا "نہیں" (اپنے باپ کا غلط جواب سُنکر) وہ لڑکا بول اٹھا کہ بلیٰ واللہ یا رسول اللہ

انا نجد لك فی التوراة نعتك وصفتك ومخرجك یعنی کیوں نہیں خدا کی قسم اے اللہ کے رسول! ہم یقیناً آپ کی تعریف آپکی صفتیں اور آپکی ہجرت کا حال تورات میں پاتے ہیں اور کہنے لگا وانی اشهد ان لا اله الا الله وانك رسول الله میں یقین کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے سچے رسول ہیں (اس کے بعد یہ لڑکا وفات پا گیا) رسول اکرم نے صحابہؓ کرام سے فرمایا اقیموا ھذا من عند رأسه ولوا اخاكم اسے اِس بچہ کے سرہانے سے اٹھا دو (اور چونکہ یہ بچہ مسلمان تھا تو تمہارا بھائی ہوا اِس لیے) اپنے اس بھائی کی تولیت و ذمہ داری سنبھالو۔

یعنی اسے اس اعزاز کے ساتھ دفن کیا جائیگا جس اعزاز سے مسلمان کو دفن کیا جاتا ہے۔

اِس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ بیمار کی عیادت سنت ہے۔ جناب رسالتمآب خود بھی عیادت فرماتے رہے ہیں اور صحابۂ کرام کو بھی اِس کی تاکید فرماتے رہتے۔ عیادت ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔ رشتہ داروں متعارف لوگوں اور پڑوسیوں کا بھی ایک دوسرے پر حق ہے کہ بیماری کی صورت میں مدد کریں اور عیادت کریں۔ احادیث میں عیادت اور بیمار پرسی کی بہت فضیلت آئی ہے۔ اِس خوف سے کسی مریض کی عیادت نہ کرنا کہ اِس کی بیماری ہمیں لگ جائیگی ہرگز مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ بیماری لگتی ہے۔ احتیاط کرنے میں مضائقہ نہیں ہے مگر اِس قدر غلو کرنا کہ مریض کی بیمار پرسی ہی چھوڑ دی جائے جائز نہیں ہے۔

ایک صحابی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اونٹ تھا جسے خارش کی بیماری لگی ہوئی تھی۔ صحابی نے وہ اونٹ دوسرے اونٹوں سے علیحدہ کھڑا کیا آنحضرت نے ایسا کرنیکی وجہ دریافت فرمائی۔ عرض کیا اسے خارش ہے اس لئے دوسرے اونٹوں سے دور رکھا تاکہ دوسروں کو یہ مرض نہ لگ جائے۔ آپؐ نے فرمایا پہلے اونٹ کو یہ مرض کیسے لاحق ہوا؟ گویا یہ بات ناگوار گزری کہ اِس سے دوسروں کو بیماری لگ جائیگی۔ اور سمجھا دیا کہ بیماری ایک دوسرے سے نہیں لگتی ہے اللہ کی مرضی سے ہی سب کچھ ہوتا ہے ایک دوسرے سے بیماری لگنے کا اعتقاد رکھنا باطل ہے اِسلام اسکی تغلیط کرتا ہے اور حکیموں اور ڈاکٹروں کے نقطہ نظر کا خلاصہ بھی زیادہ سے زیادہ یہ ہی ہے کہ احتیاط رکھی جائے۔ ورنہ کوئی معالج مریض کو دیکھا ہی نہ کرتا۔

ایک روایت میں ہے کہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ کوڑھ کا مریض آیا۔ وہ بیچارہ

خود کو لوگوں سے جُدا رکھتا تھا تاکہ کسی کو اُس کا مرض نہ لگ جائے گھن نہ آئے اور کوئی بُرا محسوس نہ کرے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے ساتھ مِل کر کھانا تناول فرمایا۔ اور فرمایا کہ کھاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو یعنی تم یہ نہ ڈرو کہ تمہارا مرض مجھے لگ جائے گا۔

اِس موقع پر بھی عمل کرکے یہی بات تعلیم فرمائی گئی کہ یہ اِعتقاد نہ رکھنا چاہیئے کہ بیمار کے ساتھ بیٹھنے سے بیماری لگ جاتی ہے تو عیادت کو اس مذکورہ خطرے کی بناء پر ترک کرنا دُرست نہیں ہے جہاں تک ہو سکے ہر بیمار کی عیادت کرنی چاہیئے خواہ اسے بیماری کسی بھی قسم کی ہو اور وُہ بیمار کسی بھی دَرجے کا ہو۔ یہ یہُودی لڑکا جو بعد میں مُسلمان ہُوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معمُولی خادم تھا مگر آپ کا اخلاق اس قدر بلند تھا کہ بنفسِ نفیس عیادت کو تشریف لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کا طریقہ بھی بتلایا ہے آپ نے مریض کے پاس بہت دیر تک بیٹھنے، گپیں ہانکنے اور شور مچانے سے منع فرمایا ہے۔ مریض کے آرام کو ملحوظ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے اور اِس کے لیے دُعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

حدیثِ مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ یہود بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا کرتے تھے۔ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف پڑھنے کے باوجُود صاف انکار کر دیتے تھے اِس مریض لڑکے کے باپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی قسم بھی دی مگر پھر بھی وُہ جھوٹ سے باز نہ آیا نہ اللہ کی قسم کی پرواہ کی اور نہ ہی خُدا کے نبیؐ کا کچھ لحاظ کیا یہ خاصہ اس پُورے طبقے کا تھا جو مدینہ شریف میں رہائش پذیر تھا۔ ان میں یہ ضِدبازی اور ہٹ دھرمی بہُت پہلے سے چلی آرہی تھی وُہ ہی ان کے اِسلام سے محرومی کا باعث بنی اور یہ ان کا گویا قومی خاصہ ہوگیا لتجدن اشد الناس عداوہ للذین امنوا الیھود والذین اشرکوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں غلط راستے پر چلنے سے محفوظ رکھے راہِ راست پر قائم رکھے اور آخرت میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نصیب فرمائے۔

ہمارے یہاں ٹیکسٹائل ملز کے سپیئر مارپٹ اور ہر قسم کے سپرنگ تیار ہوتے ہیں
پاکستان سپرنگ مینوفیکچرنگ کمپنی
برانڈرتھ روڈ، رام گلی نمبر ۱، لاہور: فون 66065

قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

انتخاب و ترجمہ
مولوی محمد عظیم بلوچستانی
متعلم جامعہ مدنیہ لاہور

۱ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

تم میں سے کوئی شخص کامل مومن نہیں ہوسکتا جبتک کہ میں اسے اُس کے باپ اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

۱ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَہْدَ لَہٗ۔

جس میں امانت داری نہیں وہ (کامل) ایمان والا نہیں اور جو عہد کا پابند نہیں اُس کا دین ہی (کامل) نہیں۔

۳ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَتْبَعَ ھَوَاہُ لِمَا جِئْتُ بِہٖ۔

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جبتک وہ اپنی خواہشات کو اس چیز کے تابع نہ کردے جو میں لایا ہوں۔

۴ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔

جو شخص اللہ کے لیے کسی سے محبت رکھے اور اللہ کے لیے کسی سے بغض رکھے اور اللہ کے لیے دے اور اللہ کے لیے دینے سے باز رہے تو یقیناً اُس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

۵ اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ۔

دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے

۶ اِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ

ہر دین کے لیے ایک خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خلق حیاء ہے

۷ مِفْتَاحُ الْجَنَّۃِ الصَّلٰوۃُ وَمِفْتَاحُ الصَّلٰوۃِ الطُّھُوْرُ۔

جنت کی چابی نماز ہے اور نماز کی چابی وضو ہے۔

۸ لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَا یَرْحَمُ النَّاسَ۔

اللہ اُس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

۹ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ۔

تحقیق اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔

۱۰ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ۔

سچا تاجر (قیامت کے روز) انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

◆◆

کلامِ نفیس

اے دوست جب سے وقفِ خرابات ہو گئی
عُمرِ عزیز کتنی خوش اوقات ہو گئی

ساقی نے اپنی ذات میں مجھ کو سمو لیا
میری حیات مستِ مئے ذات ہو گئی

دل پر پڑا جو پرتوِ حُسن و جمالِ دوست
جاری زباں پہ حمد و مناجات ہو گئی

صُبحِ ازل چلا تھا مَیں اُن کی تلاش میں
شامِ اَبد کے بعد ملاقات ہو گئی

پَو پھٹ رہی تھی محوِ نظّارہ تھے ہم، مگر
سورج کے انتظار ہی میں رات ہو گئی

فکرِ سلیم، ذوقِ نظر، ہمّتِ بلند
ہر چیز نذرِ گردشِ حالات ہو گئی

اربابِ ہوش اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
جوشِ جنوں میں مجھ سے کوئی بات ہو گئی

شعر و سخن میں اب وہ کہاں فکر و آگہی
اب شاعری ہجومِ خیالات ہو گئی

جب بھی نفیسؔ آئی ہے اُس جانِ جاں کی یاد
روئی کچھ ایسے آنکھ کہ برسات ہو گئی

جناب اختر راہی ایم اے

البیضاوی رحمۃ اللہ

قرآن حکیم کا کونسا طالب علم ہوگا جو قاضی ابوسعید ناصر الدین علی بن عمر بیضاوی اور ان کی شہرۂ آفاق تفسیر قرآن سے واقف نہ ہوگا۔ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ اُن کی تفسیر کو جتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی انکی زندگی اسی قدر تاریکی میں ہے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کی تفسیر پر ریمارکس دیئے ہیں مگر انکی تاریخِ ولادت تک نہیں لکھتے۔

مضافاتِ شیراز میں سے ایک بستی بیضا نامی ہے۔ قاضی موصوف یہیں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے "بیضاوی" مشہور ہوئے۔ وہ ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے والد ابوبکر بن سعد کے عہد میں قاضی تھے۔

مفسرِ قرآن بیضاویؒ نے مروجہ تعلیم حاصل کی اور طلبِ علم کے لیے وطن مالوف سے تبریز چلے گئے۔ تاج الدین سبکیؒ (م ۷۷۱ھ) کا بیان ہے کہ تبریز میں ایک علمی مجلس میں علامہ بیضاوی شریک ہوئے۔ چونکہ اس شہر میں غیر معروف تھے اور کسی سے شناسائی نہ تھی اس لیے مجلس کے آخر میں بیٹھے۔ مدرس نے دورانِ تدریس ایک لطیف نکتہ بیان کیا اور سامعین سے اس کی وضاحت کے لیے اِستفسار کیا۔ بیضاوی اپنی جگہ سے اٹھے اور اِس عمدگی سے بحث کی کہ خود مدرس انگشت بدنداں رہ گیا۔ مدرّس نے کہا کہ اپنے لفظوں میں ایک بار پھر بحث دُہرا دیجیے۔ چنانچہ بیضاویؒ نے جواب دہرایا اور بطورِ استفسار فرمایا کہ اِس بحث میں ایک غلطی ہے۔ ذرا آپ اِس کی تصحیح کیجیے۔ مدرّس لاجواب ہوگیا۔ اہلِ علم کی اِس مجلس میں وزیرِ مملکت موجود تھا۔ اُس نے علامہ بیضاوی کو قریب بُلایا۔ احوال دریافت کیے۔ قاضی نے جواب دیا کہ عہدۂ قضا چاہتا ہوں۔ وزیر نے خلعتِ فاخرہ سے نوازا مگر عُہدۂ قضا پیش نہ کیا۔

ایک دوسری روایت ہے کہ اُنہیں عہدۂ قضا پر فائز کیا گیا۔ مگر شیخ محمد بن تحتانی سے ارادت کے بعد منصب سے علیٰحدہ ہوگئے اور تصنیف وتالیف میں منہمک ہوگئے۔ تبریز میں ۶۸۵ھ یا ۶۸۴ھ میں وفات پائی اور اپنے شیخ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۷۱۶ھ سالِ وفات بتایا ہے۔

تالیفات:۔ امام بیضاویؒ کی مندرجہ ذیل کتابیں یادگار ہیں۔

۱۔ منہاج الوصول (فقہ) ۔ شافعی مکتبِ فکر کے مطابق فقہی مسائل پر مشتمل مختصر کتاب ہے۔

۲۔ طوالع الانوار (علمِ کلام)

۳۔ نظام التواریخ ۔ ابتدائے آفرینش سے لیکر سلطان ابوسعید (۷۱۶ھ ۔ ۷۳۶ھ) کے زمانے تک ایران کی مجمل تاریخ ہے "اسٹوری" کے بیان کے مطابق بیضاویؒ نے ۶۸۴ھ میں تاریخ لکھی تھی ۔ بعدازاں حالات کے ساتھ ساتھ اضافہ فرماتے رہے۔

کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت نوح علیہ السلام تک دس انبیاء کا تذکرہ ہے۔ دوسرے حصہ میں قدیم ایران کے تہتر بادشاہوں کا ذکر ہے۔ تیسرے حصہ میں نبی اکرمؐ اور خلفائے اسلام کے حالات بیان کیے ہیں۔ چوتھے حصہ میں عہدِ عباسیہ کے ایرانی ملوک و سلاطین کا ذکر ہے۔

"نظام التواریخ" کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف تو ہے مگر بعد میں اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ اِس رائے کی بنیاد یہ امر ہے کہ علامہ بیضاوی ۶۸۴ھ میں وفات پاگئے تھے۔ مگر جو لوگ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کو ۷۱۶ھ تک زندہ خیال کرتے ہیں ان کی رائے برعکس ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ نظام التواریخ سرے سے مفسرِ قرآن بیضاوی کی تالیف ہی نہیں۔ بلکہ کسی دوسرے بیضاویؒ کے رشحاتِ قلم ہیں۔

۴۔ انوار التنزیل واسرار التاویل

قرآنِ پاک کی تفسیر ہے اور تفسیر بیضاوی کے نام سے مشہور ہے۔ بیضاویؒ نے مشہور معتزلی مفسر جاراللہ زمخشری (م ۵۲۸ھ) کی تفسیرِ کشاف پیشِ نظر رکھی ہے۔ مگر زمخشری کے برعکس اعتزال کی تردید ہے۔ اعراب و معانی اور بیان سے متعلق نکات کشاف کی خوشہ چینی ہے۔

مؤلف کے پیشِ نظر کشاف کے علاوہ امام فخرالدین رازی (م ۶۰۶ھ) کی تفسیر کبیر اور امام راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ) کی تفسیر بھی رہی ہے۔ عبدالحق حقانی (م ۱۳۳۶ھ) لکھتے ہیں۔

اُس کتاب (تفسیر بیضاوی) میں اعراب و معانی و بیان کے متعلق جو کچھ ہے وُہ کشاف سے ماخوذ ہے اور جو کچھ حکمت و کلام سے متعلق ہے وُہ تفسیر کبیر سے ہے اور جو کچھ اشتقاق و غوامض و لطائف ارشاد سے متعلق ہے وُہ تفسیرِ راغب سے ملخص ہے اور باقی اپنا طبع زاد ہے "

تفسیرِ بیضاویؒ اسلامی دُنیا میں بکثرت پڑھی جاتی ہے۔ مشہور ہے ؎

اولوا الالباب لم یاتوا　　بکشف قِناعِ ما یُتلیٰ
ولکن کان للقاضی　　ید بیضاء لا تبلی

(اہلِ شعور و مغز قرآن پاک کے اسرار نہیں کھول سکے لیکن قاضی ناصر الدین بیضاوی کا ایسا ہاتھ "قلم" تھا کہ ان کا روشن ہاتھ بوسیدہ ہونے والا نہیں")

تفسیرِ بیضاوی پر بکثرت حواشی لکھے گئے۔ اہلِ ہند و پاک نے بھی تفسیرِ بیضاوی کے کئی حاشیے لکھے ہیں جن میں سے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۶ھ) کے حاشیے کا ذکر حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ) نے "کشف الظنون" میں کیا ہے۔ شہاب خفاجی (م ۱۰۶۹ھ) کا حاشیہ سب سے زیادہ مقبول ہے جو ۲۵ شروح و حواشی کے بعد لکھا گیا۔ اور اسی طرح قطبِ ربانی غوث صمدانی محمد محی الدین کا حاشیہ جو بنام شیخ زادہ معروف ہے، نہایت وقیع ہے۔ البتہ روایتوں کے بارے میں اس قدر مقبولیت کے باوجود تفسیر خامیوں سے پاک نہیں۔ مولانا تھانوی کا بیان ہے۔ "غور و ایات کو روایت کر دیا ہے اِس تفسیر میں فضائل سور کے بارے میں احادیث کو احتیاط سے قلمبند نہیں کیا"

شیخ عبد الحق محدّث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) رقمطراز ہیں۔

"بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ در تفسیرِ قرآن و شرح احادیث ازیں باب
قباحتہا بسیار کردہ تجاوز اللہ عنہ و اگر آن مواضع را بشمارم سخن دراز گردد"

چنانچہ محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) نے تفسیر بیضاوی پر ایک نامکمل حاشیہ "تعلیق الحاوی علی تفسیر البیضاوی" لکھا۔ حاشیہ لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر بیضاوی کے مؤثر و معتبر حصوں کو ابھارا جائے اور دور از کار مباحث علیحدہ کیے جائیں تاکہ اس کی افادیت بڑھ جائے۔ افسوس کہ شیخ محدث (م ۱۰۵۲ھ) کے اس حاشیے کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ موجود نہیں۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ (القرآن)

بیشک اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو جہالت میں بدی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں لیکن پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں

مولانا سیّد حُسین احمد مدنیؒ

کے بارے میں اپنے سابقہ گستاخانہ اور توہین آمیز رویّے پر

اعترافِ تقصیر و اظہارِ ندامت

اور

علّامہ اقبال مرحوم

کے

اشعار متعلّقہ مولانا سیّد حُسین احمد مدنیؒ کی ضروری وضاحت

از قلم

پروفیسر یُوسُف سلیم چشتی

ملنے کا پتہ

دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" ○ جامعہ مدنیّہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ

یہ اہم مضمون محترم جناب پرفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے آج سے کوئی چار سال پہلے عہدِ ایوبی میں لکھا تھا۔ بعض وجوہات کی بناء پر اس کی اشاعت معرضِ التواء میں پڑی رہی۔ اب اسے ماہنامہ "میثاق" میں طبع کر دیا گیا ہے اور ہم اسے بشکریہ "میثاق" آپکی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ـــــ "میثاق" کے مدیرِ شہیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے رسالہ میں مضمون اور صاحبِ مضمون کو متعارف کرانے کی غرض سے جو چند تمہیدی سطور تحریر فرمائی ہیں وہ بھی پیشِ خدمت ہیں۔ لکھتے ہیں

"جہاں تک مولانا حسین احمدؒ مدنیؒ کے سیاسی موقف و مسلک کا تعلق ہے، اس سے اختلاف نہ پہلے گناہ تھا نہ اب ہے، لیکن جہاں تک ان کے دینی و علمی مقام اور اخلاقی و روحانی مرتبے سے انکار اور ان کے خلوص و اخلاص اور بے غرضی کے بارے میں شک و شبہ کا تعلق ہے وہ یقیناً ایک بہت بڑی جہالت تھی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر، جہاں تک انکی شان میں گستاخانہ اور توہین آمیز روش اور تمسخر و استہزاء کے عملی ارتکاب کا تعلق ہے وہ یقیناً بہت بڑا گناہ اور "یَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَھَالَۃٍ" کا کامل مصداق تھا اور یہ خطا جس سے بھی سرزد ہوئی اس پر لازم ہے کہ ببانگِ دہل اعترافِ تقصیر اور علی الاعلان اظہارِ ندامت کرے اور علیٰ رؤوسِ الاشہاد اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ سے معافی کا خواستگار ہو ـــــ مخدومی پرفیسر یوسف سلیم چشتی پر اللہ تعالےٰ کا بڑا فضل و کرم ہوا کہ انہیں اس مشکل کام کی توفیق بارگاہ خداوندی سے حاصل ہو گئی۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء، پروفیسر صاحب کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ قافلہ مسلم لیگ کے حدی خوانوں اور تحریکِ پاکستان کے دوران پرجوش اور انتھک کارکنوں میں سے ہیں اور ابھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنکے کانوں میں تا حال انکی تحریکِ پاکستان کے دوران ازپشاور تا بہ پونا، کی ولولہ انگیز تقریروں کی گھن گرج موجود ہے، لہٰذا انکی اس تحریر میں اگر کچھ تلخی نظر آئے تو اسے ان کے شدّتِ احساس ہی پر محمول کرنا چاہیئے اس لیے کہ تحریکِ پاکستان کے تمام مخلص کارکنوں کو پاکستان میں پیش آمدہ حالات و واقعات سے جس مایوسی اور دل شکستگی (FRUSTRATION) کا سامنا رہا مختلف افراد میں اسکے احساس کی شدّت فطری طور پر ہر شخص کے ذاتی خلوص اور اسکی امیدوں اور توقعات کی نسبت ہی سے پیدا ہوئی اور آئندہ صفحات میں دراصل ایک ایسے شخص کا خلوص و اخلاص تلخی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جس نے اپنی عمر کے بہترین دور میں، اپنی جملہ صلاحیتیں اور تمام توانائیاں حصولِ پاکستان کے مقصد میں کھپا دی تھیں ـــــ پروفیسر صاحب کی اس تحریر میں ایک مقالے کی سی ترتیب کی توقع ہی غلط ہے اسلیے کہ اس کا منشاء عقل نہیں دل ہے اور یہ قلبی واردات کے رقم کرنے کا معاملہ ہے جس کا اصل حسن بے ربطی و تکرار ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی

ع "ربطِ محکم اسی بے ربطیٔ تحریر میں ہے!" ـــــ اشرف۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

رب انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا و انہ لا یغفر الذنوب الا انت
فاغفرلی مغفرۃ من عندک و ارحمنی انک انت الغفور الرّحیم

مُقدّمہ

اس تحریر سے دو مقاصد میرے پیشِ نظر ہیں۔ پہلا مقصد تو یہ ہے کہ گذشتہ زندگی (۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۴ء) میں مجھ سے جس قدر گستاخیاں حضرتِ اقدس مجاہد اعظم شیخ الاسلام آیۃ مّمن آیات اللہ الصمد سیدی وشیخی وسندی الحاج الحافظ المولوی السید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کی شان رفیع البنیان میں سرزد ہوئی ہیں، اُن پر اللہ تعالےٰ اور اس کے بندوں کے سامنے غیر مشروط انداز میں اظہارِ ندامت اور اعترافِ تقصیر اور اقرارِ جرم کروں اور بارگاہ ایزدی میں صدقِ دل سے استغفار کروں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک اہم تاریخی واقعہ کی وضاحت کردوں اور حقائق کو ان کی اصل شکل میں پیش کردوں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے محض اخباری اطلاع کی بناء پر تین اشعار سپردِ قلم کیے تھے جن کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ جناب طالوت نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول ومنعطف کرائی کہ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وطن کو اساسِ ملّت بنالو، اس لیے دیانت وعدالت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اعلان کردیں کہ اب مجھے حضرت مولانا حسین احمد صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ اعلان روزنامہ "احسان" لاہور میں ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوگیا تھا، لیکن قوم کی بدقسمتی سے ۲۱ اپریل کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوگیا جبکہ ان کا آخری مجموعہ کلام موسوم بہ "ارمغانِ حجاز" نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اگر یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان تین اشعار کو حذف کردیتے یا حاشیے میں اس حقیقت حال کو واضح کردیتے کہ میں نے یہ اشعار غلط اخباری اطلاع کی بناء پر لکھے تھے۔ بعدازاں حضرت مولانا نے اخباری رپورٹ کی تردید کردی اس لیے ان اشعار کو کالعدم یا مسترد سمجھنا چاہیئے، لیکن افسوس کہ یہ

مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس لیے نہ ان اشعار کو حذف کیا گیا اور نہ حاشیے میں حقیقت حال کو واضح کیا گیا۔

نتیجہ اس غفلت اور کوتاہی کا یہ نکلا کہ گذشتہ تیس سال سے مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان بالخصوص ان اشعار کی بنا پر حضرتِ اقدسؒ سے بدگمان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملّتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی اصلاحِ خیال کا فریضہ بھی انجام دے دوں تاکہ وہ سوءِ ظن کے گناہ سے محفوظ ہو جائیں۔ میں ان اشعار کو تو خارج نہیں کر سکتا، مگر مسلمانوں کو یہ تو بتا سکتا ہوں کہ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی تقریر میں نہ تو یہ فرمایا تھا کہ ملت کی بنیاد وطن ہے اور نہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تم وطن کو اپنی ملّت کی بنیاد بنالو۔ یہ اشعار بلا تحقیقِ حال سپردِ قلم ہو گئے تھے چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب پر حقیقت منکشف ہوئی تو انہوں نے اپنے الفاظ واپس لے لیے تھے بالفاظ دیگر ان اشعار کو قلمزد کر دیا تھا۔ دعا ہے اللہ تعالےٰ میری توبہ قبول فرمائے اور میری اس تحریر کو عامۃ المسلمین کے لیے نافع بنائے۔ آمین

باب اوّل

اعتراف جُرم و گناہ وخطا — و — استغفار از خالق ارض وسماء

فصلِ اوّل

انسانی فطرت ہے کہ اُسے اختلافِ رائے برداشت کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اپنے مخالف کو زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جاتی۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے سلاطینِ وقت سے اختلاف کیا تو اختلاف کرنے والوں کو انہوں نے طاقت کے نشے میں مست ہو کر یا قتل کر دیا یا محبوس۔ اور جنہوں نے علماءِ سوء سے اختلاف کیا تو انہیں علماءِ سوء نے دائرہ اسلام سے خارج کر دیا۔ چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

(۱) امام ابوحنیفہؒ نے بادشاہِ وقت سے اختلاف کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے قید خانہ میں وفات پائی۔

(۲) امام احمد بن حنبل (المتوفی سنہ ۲۴۱ھ) نے مسئلہ خلقِ قرآن میں مامون سے اختلاف کیا تو اس نے انکو بے دریغ اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔

(۳) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو والیٔ بخارا نے جلاوطن کر ڈالا۔

(۴) ۴۵۰ھ میں اشاعرہ پر حکومت کی طرف سے مصائب کا نزول ہوا اور ابن حزم ظاہری (المتوفی ۴۵۶ھ) نے انہیں گمراہ قرار دیا۔

(۵) امام ابن تیمیہؒ (المتوفی ۷۲۸ھ) کو علماء نے کافر قرار دیا۔

(۶) محمد عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۱ھ) نے اپنے مخالفوں کو کافر قرار دیا۔

(۷) ہمارے زمانہ میں بریلی کے ایک بزرگ نے بیک جنبشِ قلم تمام علماء دیوبند کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا، کیونکہ یہ حضرات مشرکانہ عقائد اور مبتدعانہ اعمال میں خانصاحب سے متفق نہیں تھے۔

پہلے یہ متعصبانہ اور ظالمانہ روش اور تنگ نظری صرف عقائد تک محدود رہا کرتی تھی، مگر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ بیماری سیاست کی دنیا میں بھی داخل ہو گئی ——— جن لوگوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کا پُر آشوب دور دیکھا ہے۔ ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حامیانِ مسلم لیگ اُن تمام مسلمانوں کے اسلام کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو ان سے دلائلِ واضحہ اور براہینِ نیرّہ کی بناء پر اختلاف کرتے تھے۔ نیز بلا استثنا ان تمام مسلمانوں کو غدارِ قوم، ضمیر فروش اور ہندوؤں کے زر خرید کہا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی (جب ہوش رخصت ہو جاتا ہے اور صرف جوش کار فرما ہوتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے) کہ مسلم لیگ کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیا گیا تھا۔ چنانچہ ہر شخص ببانگِ دہل یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ حالانکہ کفر و اسلام کا معیار کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں ہے۔ بلکہ اتباعِ شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے اور طرفہ تماشہ یہ ہے جس پر آج میری عقل بھی حیران ہے کہ مسلم لیگ تو وہ جماعت تھی جس میں داخلے کے لیے نہ مسلمانوں کی سی صورت شرط تھی نہ ان کی سی سیرت۔ نہ نماز روزے کی پابندی شرط تھی نہ دین سے واقفیت، اہلِ قرآن، اہلحدیث، اہل فقہ اور اہل تصوف۔ بریلوی اور دیوبندی، سنّی اور شیعہ، احمدی اور کمیونسٹ سب اس کے رکن بن سکتے تھے اور ۱۹۳۱ء میں اس کا صدر وہ شخص تھا جس کے ہمخیالوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے ۱۹۵۳ء میں کراچی سے لاہور تک زبردست ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم دین کیوں نہ ہو۔ یہ تصوّر کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ ہندوؤں کا غلام ہے ضمیر فروش ہے، غدّارِ قوم ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، خواص کے دماغوں پر بھی مسلّط ہو چکا تھا چنانچہ وہی مولانا ظفر علی خاں جنہوں نے حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔

گرمیٔ ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے

جس سے ہے پرچم روایاتِ سلف کا سربلند

جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہوگیا کہ انہوں نے اُسی حسین احمد سے یوں خطاب کیا اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ میں کس عظیم المرتبت ہستی کو مخاطب بنا رہا ہوں ؎

حسین احمد سے کہتے ہیں مدینے کے خزف ریزے کہ لٹو ہوگئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پر

اس شعر سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے شیخ الاسلام مجاہدِ اعظم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز کا علمی اخلاقی اور روحانی مقام خان مرحوم کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے لیگ سے اختلاف کیا تھا خصوصاً ارکانِ جمعیۃ العلماء ہند ان کی نیت نیک تھی۔ وہ ہرگز ضمیر فروش یا غدارِ قوم یا ہندوؤں کے زرخرید نہیں تھے، چنانچہ عزت مآب صدر مملکت پاکستان بالقابہٗ[1] نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "FRIENDS NOT MASTERS" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں:

سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سے علماء نے قائدِ اعظم سے علی الاعلان اختلاف کیا تھا اور پاکستان کے تصور کی تردید کی تھی۔ لیکن میرے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن علماء نے تشکیلِ پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ سب ضمیر فروش تھے۔ ان میں قابل اور مخلص لوگ بھی تھے۔ ہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی تشکیل سے ان کا اقتدار ختم ہو جائیگا۔[2]

فی الجملہ حقیقت یہی ہے کہ جمعیۃ العلماء کے ارکان نہ قوم کے بدخواہ تھے نہ ضمیر فروش بلکہ وہ علی وجہ البصیرت یہ سمجھتے تھے کہ نہ تو تقسیم ہند سے ہندی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا، کیونکہ انکی ۱/۳ آبادی ہندوستان میں ہندوؤں کے رحم وکرم پر رہ جائے گی اور وہ انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں گے اور نہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو سکے گی، کیونکہ لیگ کے اربابِ حل وعقد کی غالب اکثریت نہ دین سے واقف ہے اور نہ اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، لیکن حامیانِ لیگ نے مخالفت کے جوش میں اسلامی تہذیب اور علماء دین کے احترام دونوں باتوں کو طاق پر رکھ دیا اور اختلاف

---

[1] مراد ہیں سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب، واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے کئی سال قبل کی ہے

[2] عزت مآب صاحبِ صدر بالقابہٗ کے اس خیال سے مجھے کلیتہً اتفاق نہیں ہے۔ (سلیم چشتی)

کرنے والوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھی بلکہ اس پر فخر کیا۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں :۔

(۱) جب وہ ٹرین جس میں لیگ کے مخالف مسلمان قائدین سفر کر رہے تھے علی گڑھ پہنچی تو یونیورسٹی کے مسلمان طلباء نے ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی نازیبا اور خلافِ تہذیب حرکات کیں جن کی وضاحت بذاتِ خود خلافِ تہذیب ہے اور اگر وضاحت بھی کی جائے تو کوئی شخص یقین نہیں کرے گا کہ کوئی شریف آدمی ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

(۲) جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سید پور ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو حامیان لیگ کا ایک انبوہِ کثیر پلیٹ فارم پر جمع ہو گیا۔ ان لوگوں نے حضرت اقدسؒ کو گالیاں دیں اور جب حضرت موصوف پلیٹ فارم پر اترے تو مخالفین نے حضرتؒ کو زمین پر گرانے کی کوشش کی اور گریبان پھاڑ دیا اور ایک شخص نے عمامہ سر سے اتار لیا اور پہلے اُسے پاؤں سے روندا پھر نذرِ آتش کر دیا۔

(حیات شیخ الاسلام صفحہ ۲۳۲ تا ۲۳۴)

مَیں نے دل پر جبر کر کے صرف دو واقعات درج کر دیئے ہیں۔ تفصیل سے عمداً اجتناب کیا ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اُس زمانے میں حامیان لیگ کی ذہنیت ایسی ہو گئی تھی کہ جو شخص ان سے سیاسی اعتبار سے اختلاف کرتا تھا اس کے ساتھ ہر بدسلوکی اور بے ادبی روا رکھی جاتی تھی بلکہ اُسے کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔

آج جب بیس سال کے بعد ایک طرف ہمارے جوش اور ہیجان میں سکون کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور دوسری طرف زندگی کے تلخ تر حقائق نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں تو ہم پرانے مسلم لیگی، ان لوگوں کو رواداری کا ایڈیشن دے رہے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے نامور صحافی میم شین نے (جسے میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں) اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا مسلمانانِ پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا:

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم صیہونیت کے پروپاگنڈے کے زیرِ اثر انہیں (جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ مصر) فرعون کی نسل کا علمبردار اور بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا نقاد بنا کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ صدر ناصر عقائد کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے۔"

سبحان اللہ! آج اس درسِ اخوت کی صداقت میں کس پاکستانی کو شک ہو سکتا ہے، لیکن مَیں بڑے

بھائی کی حیثیت[1] سے اپنے پیارے میم شین سے پوچھتا ہوں کہ جب قوم پرور مسلمان (کانگرسی، جمعیتی اور احراری) زعمائے مسلم لیگ کی خدمت میں یہی حقیقت ثابتہ (یہی درسِ اخوت وانسانیت) بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے کہ۔

"یہ سچ ہے کہ جمعیتہ العلماء اور مجلسِ احرار کے ارکان تقسیمِ ہند کے حامی نہیں ہیں، کیونکہ وہ اس کو اپنی فراستِ مؤمنانہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے بہت مضر سمجھتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم لیگ کے پروپاگنڈے کے زیرِ اثر انہیں ہندوؤں کا حاشیہ بردار اور کفر کا علمبردار اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا حامی بنا کر اپنے (مسلمان) لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور ان کے ہمخیال حضرات عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے۔" تو کونسا مسلم لیگی ان کی اس معقول بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوتا تھا؟ یا ہو سکتا تھا اس زمانے میں تو سیاسی اعتبار سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کا یہ عالم تھا کہ جب "الجمعیتہ" نے علی گڑھ ریلوے سٹیشن پر طلبہ کی گستاخی اور بدتہذیبی پر صدائے احتجاج بلند کی تو ڈان نے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ "گلدستوں کے بجائے ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے۔"

میرا مطلب اس تلخ نوائی سے صرف اسقدر ہے کہ اُس زمانے میں ذہنیت ہی اس قسم کی ہو گئی تھی کہ ہم نے حفظِ مراتب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور یہ راقم سیہ کار بھی اسی کشتی میں سوار اور اسی غلطی کا شکار تھا یعنی میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو

---

[1] میں نے اپنی اس حیثیت کو بطور سپر استعمال کیا ہے، کیونکہ اس ملک میں یہ خیال روز بروز پختہ تر ہوتا جا رہا ہے کہ ہم کو کامل آزادی ہر بات کی آزادی ۔ حاصل ہو چکی ہے، اس لیے کسی شخص کو ہمیں نصیحت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، چنانچہ آج فجر کی نماز کے علاوہ ہر نماز کے وقت مسلمان پوری آواز کیساتھ مسجد سے ملحق ہر ہوٹل میں فلمی گانوں کے ریکارڈ بجاتا رہتا ہے اور کراچی شریف سے لے کر لاہور شریف تک کسی مسلمان میں یہ جرأت نہیں ہے کہ اس مسلمان سے یہ کہہ سکے کہ اس شور وغل سے نمازیوں کی نمازیں اور مریضوں کے آرام میں خلل پڑ رہا ہے ۔ اس عاجز نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں ہندو مسجد کے پاس سے باجہ بجاتے گزر جاتے تھے تو مسلمانوں کی نمازیں شدید خلل رونما ہو جاتا تھا، لیکن پاکستان میں ۲۴ گھنٹے مسجدوں کے پہلو میں فلمی گانے سمع خراشی کرتے رہتے ہیں، مگر کسی کی نماز میں خلل نہیں پڑتا، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ باجہ مشرف باسلام ہو گیا ہے، بینوا توجروا

مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو علماء لیگ میں نہیں تھے ان کی عظمت، وقعت عزت اور منزلت میرے دل سے بالکل نکل گئی تھی حالانکہ اب بیس سال کے بعد جب اس حماقت پر غور کرتا ہوں تو عرقِ ندامت میں غرق ہو ہو جاتا ہوں مثلاً صرف ایک واقعہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

اپریل ۱۹۴۱ء میں مجھے انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ ضلع سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں تقریر کی دعوت موصول ہوئی، چونکہ یہ انجمن غیر سیاسی تھی اس لیے اس کے جلسوں میں لیگی اور غیر لیگی ہر مکتبِ خیال کے مقررین مدعو کیے جاتے تھے، چنانچہ دیوبند سے حضرت مدنیؒ اور شجاع آباد سے قاضی احسان احمد مرحوم بھی تشریف لائے تھے۔

اس زمانے میں میری ذہنی کیفیت یہ تھی کہ میں غیر سیاسی جلسوں میں بھی ایسا موضوع اختیار کیا کرتا تھا جس کی تان بالآخر سیاست پر ٹوٹ سکے تاکہ میں لیگ کا پروپاگنڈا کر سکوں[1]، چنانچہ یہاں بھی یہی کیا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد میرے دوست قاضی احسان احمد مرحوم میرے کمرے میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی جو آپ کی تقریر کے وقت سٹیج پر تشریف فرما تھے، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ نیز یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ میرے پاس چل کر آنا پسند نہ کریں تو میں خود آپ سے ملنے آسکتا ہوں۔"

یہ پیغام سن کر میں نے قاضی صاحب سے بلا تامل کہا کہ میرے اور مولانا کے سیاسی عقائد و افکار میں بُعد المشرقین ہے۔ اس لیے اس ملاقات سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوگا۔ میرے محترم قاضی صاحب مرحوم یہ غیر متوقع جواب بے صواب سن کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ آج ستائیس سال کے بعد میں اس تلخ حقیقت کا اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ جس بات نے مجھے اس جواب پر آمادہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ علامہ اقبال مرحوم کا اعلان مندرجہ اخبار "احسان" مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء تو میرے دماغ سے محو ہو گیا تھا، لیکن یہ مصرع ہنوز ذہن نشین تھا کہ: ع چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ حضرت اقدسؒ سے گفتگو یا ملاقات دونوں باتوں کو میں اپنے زعمِ باطل میں اپنے مرتبہ موہومہ سے فروتر سمجھتا تھا۔

---

[1] مثلاً انجمن مدرسۃ البنات جالندھر ایک غیر سیاسی انجمن تھی، مگر میں نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۳ء تک ہر سال اس انجمن کے پلیٹ فارم سے لیگ ہی کا پروپاگنڈہ کیا، جس کی یاد اس زمانے کے سامعین کے دلوں سے ابھی تک محو نہیں ہوئی ہے۔

پاکستان میں جن لوگوں سے حضرۃ اقدس کا علمی، دینی اخلاقی اور روحانی مقام ابھی تک پوشیدہ ہے وہ سب اسی طرح شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں

میں نے یہ وضاحت اس لیے کی ہے کہ پاکستان میں جن لوگوں سے حضرت اقدسؒ کا علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی مقام ابھی تک پوشیدہ ہے وہ سب اسی طرح شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس طرح میں اس زمانے میں مبتلا تھا، چونکہ اللہ کے فضل وکرم سے مجھ پر حضرت اقدس کا روحانی مقام منکشف ہوچکا ہے۔ اس لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس زمانے کے مسلمانوں کو یاد دلاؤں کہ علامہ مرحوم نے اُن اشعار کو جن کی وجہ سے حضرت اقدس کے روحانی مقام کے بارے میں مسلمانوں کو غلط فہمی ہوئی، کالعدم قرار دیدیا تھا۔ اگر ارمغان حجاز ان کی زندگی میں شائع ہوتی تو وہ یہ اشعار یقیناً حذف کر دیتے۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی۔

باز آمدم برسر مطلب۔ دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہوکر بیٹھا تھا کہ قاضی صاحب مرحوم دوبارہ میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ حضرت اقدس فرماتے ہیں کہ گفتگو سے میرا مقصد اُسی بعد المشرقین کو دُور کرنا ہے۔ آپ نے گذشتہ شب اپنی تقریر میں بڑے یقین کے ساتھ یہ دعوی کیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت علی منہاج النبوۃ قائم ہوگی جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ پاکستان میں شرعی احکام کا نفاذ ہوگا، لیکن آپ نے اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں دی، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس دعوے پر آپ کے پاس دلیل کیا ہے؟ قاضی صاحب مرحوم کی زبان سے حضرت اقدس کا یہ پیغام صداقت الیٰنام سُن کر میں مبہوت وششدر ہوکر رہ گیا، کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس اپنے دعوے پر کوئی دلیل (نہ معقول نہ غیر معقول) نہیں تھی۔

شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں

میری حالت ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ رہی کہ میں خداوندانِ لیگ پر "ایمان بالغیب" رکھتا تھا جو اعلانات اور دعاوی وہ لوگ اپنی تقریروں اور اپنے بیانات میں قوم کے سامنے بلکہ دنیا کے سامنے کرتے رہتے تھے میں ان پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آتا تھا اور اپنی دعاوی کو اقبال کے کلام بلاغت نظام سے مزین کرکے اور کانگرس پر طنز ومزاح سے چٹ پٹا کرکے اپنی تقریروں میں بیان کر دیا کرتا تھا اور جب کبھی میرا ذہن مجھ سے یہ کہتا تھا کہ جو کچھ تو کہتا ہے اس پر تیرے پاس دلیل کیا ہے تو میں اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کرتا تھا کہ بھلا لیگ ہائی کمان کے

جس طرح میں اس زمانے میں مُبتلا تھا

سربرآوردہ ارکان جو قدوۃ القوم ہی نہیں بلکہ زبدۃ القوم بھی ہیں، جھوٹ بول سکتے ہیں یا اپنی بھولی بھالی اور نوے فیصد جاہل قوم کو دھوکا دے سکتے ہیں؟ چونکہ یہ امر ممکن الوقوع نہیں اس لیے منطقی اعتبار سے اس کا عکس صحیح ہوگا یعنی یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ برہان نہیں ہے بلکہ سفسطہ اور مغالطہ ہے جو میں اس زمانے میں اپنے نفس کو دیا کرتا تھا، لیکن جماعتی تعصب انسان کو ایسا اندھا کر دیتا ہے کہ وہ حسن اور قبح میں امتیاز نہیں کر سکتا، یعنی وہ سفسطہ کو برہان اور مغالطے کو دلیل سمجھنے لگتا ہے۔

چنانچہ میں نے یہ غیر معقول بات کہہ کر قاضی صاحب مرحوم سے اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ جس طرح انہیں (حضرتِ اقدس کو) یہ یقین ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہرگز قائم نہیں ہوگی اسی طرح مجھے یہ یقین ہے کہ ضرور قائم ہوگی اسلیے گفتگو بیکار ہے اور ملاقات بے سود۔[1]

جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں میں حضرت اقدسؒ کی طرف سے بدگمان تھا یعنی نفس امارہ کے پھندے میں گرفتار تھا اسی لیے میں نے حضرت اقدسؒ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ لہٰذا اب جبکہ حضرت اقدسؒ کی جلالتِ شان، للّٰہیت، بزرگی اور بارگاہ رسالت میں ان کی قدر و منزلت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے اس لیے بصمیم قلب، انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے اپنی خطا اور گستاخی کی معافی طلب کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، اظہار ندامت کرتا ہوں اور اس اعترافِ گناہ کو اس نیّت سے شائع کرتا ہوں کہ قارئین میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمالے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے دن مجھ سے اس گستاخی پر مواخذہ نہ کرے جو میں نے اس کے مقرب بارگاہ بندے کی جناب میں روا رکھی تھی۔ ربّ انی ظلمت نفسی ظلماً عظیماً۔

---

[1] کس کا قیاس صحیح نکلا اور کس کا غلط؟ اس کا کچھ اندازہ "نوائے وقت" لاہور مورخہ ۶ جون ۱۹۶۸ء کے لیڈر (اداریے) کے اس جملے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ "پاکستان میں اگر شروع سے اسلامی نظریات و شعائر، اسلامی ضابطۂ حیات اور اسلام کے نظام مالیات و قانون کو اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی تو آج حالات یقیناً مختلف ہوتے اور کسی کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی کہ ملک کے تمام دولت آفریں وسائل پر اور تمام تر دولت پر مٹھی بھر افراد کا قبضہ ہے۔" اس معصوم تمنا کے جواب میں نصیر دہلوی کا یہ شعر مدیرِ نوائے وقت کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے ؎

خیالِ زلف میں شب بھر نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

فصلِ دوم

اکتوبر ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں لی مارکیٹ کراچی میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ایک کار میرے قریب آکر رُکی اور اس میں سے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ باہر نکلے اور میری طرف بڑھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ حضرت نے حسب معمول مجھے معانقے سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہیں فرصت ہو تو میرے ساتھ چلو تم سے ایک ضروری گفتگو کرنی ہے۔ میں نے عرض کی بسر و چشم۔ حضرتؒ نے ڈرائیور سے کہا کہ برنس گارڈن چلو، وہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کی نماز پڑھی، اس کے بعد حضرتؒ مجھے ساتھ لے کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میرے میزبان نے کل مجھ سے کہا کہ "ایک صاحب نے جن کا نام پروفیسر یوسف سلیم چشتی ہے، "ارمغان حجاز" کی شرح میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی شانِ اقدس میں گستاخی بھی کی ہے اور اُن اشعار کی شرح میں جو اقبال نے حضرت مدنی کے بارے میں لکھے ہیں اقبال کے اُس اعتراف کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس کے بعد ان اشعار کا وجود ہی کالعدم ہو چکا ہے۔" حضرت نے فرمایا کہ میں نے اُن سے کہا کہ میں شارح کو بخوبی جانتا ہوں انشاء اللہ لاہور پہنچ کر اُن سے اس معاملے میں گفتگو کروں گا لیکن حُسنِ اتفاق سے آج تم مجھے یہیں مل گئے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہاری توجہ اس طرف مبذول کر دوں اور تمہاری غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دوں۔"

یہ سُن کر میں نے معذرت آمیز انداز میں نیچی نگاہ کر کے عرض کی کہ "حضرت بلاشبہ مجھ سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے شرح لکھتے وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہی نہیں ہوا کہ علامہ اقبال نے اپنی وفات سے تین ہفتے پیشتر اپنا بیان روزنامہ "احسان" میں شائع کر دیا تھا کہ حقیقت حال منکشف ہو جانے کے بعد اب مجھے مولانا حسین احمد صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تینوں اشعار کالمعدوم کا مصداق ہو گئے اور "ارمغان حجاز" میں ان کے اندراج کا

حضرت لاہوریؒ سے میرے تعلقات ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئے تھے۔ تقریب کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۹۲۹ء میں انجمن حمایت اسلام نے علامہ اقبال مرحوم اور سید غلام بھیک نیرنگ مرحوم کی نگرانی میں اشاعت اسلام کالج قائم کیا تھا اور کالج کمیٹی نے جس کے صدر محترم حضرت لاہوریؒ تھے، میرا تقرر بحیثیت پرنسپل کیا تھا۔ میں کالج کے نظم و نسق کے سلسلے میں مشورہ کرنے اور ہدایات حاصل کرنے کے لیے حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ میرے اظہارِ ندامت اور اعترافِ تقصیر کے بعد حضرت لاہوریؒ نے مجھ سے دریافت کیا۔ "تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو؟" میں نے عرض کی کہ "حضرت میں آپ کو ۱۹۲۹ء سے جانتا ہوں اور آپ کو اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں میں شمار کرتا ہوں۔" یہ سُن کر فرمایا۔ "میری بات کا یقین کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "ضرور یقین کروں گا کیونکہ اللہ والے جھوٹ نہیں بول سکتے۔" یہ سن کر فرمایا۔ "تو سنو! میں تمہاری بدگمانی دُور کرنے کے لیے تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں اور میرے علم کی رو سے اس وقت روئے زمین پر کوئی شخص روحانیت، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے اعتبار سے حضرتِ اقدس شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔" میں نے پوچھا۔ "آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

فرمایا۔ "میں حج کے مواقع پر خاصانِ حق کے اجتماع میں برابر شریک ہوتا رہا ہوں۔ ان سبھوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس وقت روئے زمین پر حضرت موصوف کا جواب نہیں ہے۔" میں سراپا حیرت بنا ہوا حضرت لاہوریؒ کی زبان سے حضرت مدنیؒ کی عظمت کا اعتراف سُن رہا تھا۔ اس کے بعد حضرت موصوفؒ نے فرمایا۔ "حضرت مدنیؒ کی جوتیوں کا تلا بھی میری داڑھی سے زیادہ محترم ہے۔ بلاشبہ وہ اس زمانے میں اللہ کی ہستی کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی ہیں، چونکہ میں تمہیں عزیز رکھتا ہوں اس لیے تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ حضرت مدنیؒ کی شان میں تم سے جو گستاخیاں سرزد ہوئی ہیں ان سے رجوع کر لو اور اللہ سے التجا کرو کہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے۔ اگر تم حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ ہوتے تو ہرگز ایسی گستاخی کا ارتکاب نہ کرتے۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ تم پر حضرت اقدس کا مقام واضح کر دے۔ تم اس بات پر غور کرو کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت اقدسؒ کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے اس کے باوجود ان کا نہایت احترام کرتے تھے اور اپنی مجالس میں ان کی روحانی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت لاہوریؒ مجھے میرے مکان پر پہنچا کر اپنے میزبان کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت کی

مجھے یقین تھا کہ جھوٹ حضرت لاہوریؒ کی زبان سے نہیں نکل سکتا ہے

اس تلقین کا اس سیہ کار پر ایسا اثر ہوا کہ دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ پردہ جو میرے اور حضرت مولانا مدنیؒ کے مابین حائل تھا، یک لخت ہٹ گیا۔ اور انکی عظمت کا ایک نہ مٹنے والا نقش میرے دل پر قائم ہوگیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میں حضرت لاہوریؒ سے ۲۵، ۲۶ سال سے واقف تھا اور مجھے یقین تھا کہ جھوٹ ان کی زبان سے نہیں نکل سکتا اس لئے ان کی گواہی کے بعد پھر مجھے کسی دلیل کی حاجت باقی نہیں رہی۔

اس جگہ ضمناً یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ایمان باللہ کا دارومدار بھی تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی پر ہی ہے ورنہ ہم میں سے خدا کو کس نے دیکھا ہے؟ اور کون دیکھ سکتا ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ہمارا ایمان دراصل صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ ہی کی گواہی پر موقوف ہے اور اس بات کا اعتراف ولیم میور جیسے مخالف نے بھی کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "حضرت) ابوبکرؓ کو ذاتی اعزاز یا استعلاءِ نفس کی مطلق آرزو نہیں تھی اگرچہ انہیں اقتدار کلی حاصل تھا، مگر انہوں نے اسے صرف اسلام کے مفاد کے لیے استعمال کیا، لیکن ان کی قوت کا عظیم راز اُن کے اس ایمان میں مضمر تھا جو انہیں (حضرت) محمد (صلعم) کی رسالت پر تھا۔ بہرحال ان کے پیشِ نظر صرف ایک ہی سوال رہتا تھا اور وہ یہ تھا کہ انہوں (آنحضرتؐ) نے کیا حکم دیا تھا؟ یا اگر وہ ہوتے تو اس معاملے میں کیا کرتے؟ اور اس ضابطۂ حیات سے حضرت ابوبکرؓ نے تادم آخر سرمو انحراف نہیں کیا اسی کی بدولت انہوں نے فتنۂ ارتداد کا قلع قمع کر دیا اور اسلام کی بنیادوں کو ہمیشہ کے لیے استوار کر دیا۔ ان کا عہدِ حکومت اگرچہ مختصر تھا، مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خود محمد (صلعم) کے بعد اسلام ابوبکرؓ سے بڑھ کر کسی شخصیت کا ممنونِ احسان نہیں ہے۔ میں نے ابوبکرؓ کی زندگی اور سیرت پر جو اس قدر تفصیل سے کلام کیا ہے اسکی ایک وجہ تو یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ پر ان کا ایمان راسخ خود محمد (صلعم) کی صداقت پر ایک ناقابلِ تردید شہادت ہے اگر آنحضرت مفتری علی اللہ ہوتے، تو وہ اس شخص کی عقیدت اور رفاقت کو حاصل کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتے تھے جو زیرک اور صاحب بصیرت ہی نہ تھا بلکہ جس کی ساری زندگی سادگی، استواری اور اخلاص کا مظہرِ اتم تھی۔"

(خلافت۔ اس کا آغاز، عروج اور انحطاط، مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۲۴ء صفحہ ۸۱)

مارچ ۱۹۵۷ء میں کراچی سے نقل مکانی کر کے لاہور واپس آیا تو زندگی میں پہلا انقلاب یہ رونما ہوا کہ حضرت

لاہوریؒ کی مجالسِ ذکر میں شرکت شروع کی۔ حضرت اس سیہ کار پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ یعنی مجلسِ ذکر میں اپنے بائیں جانب پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کبھی تنہائی میں ملاقات ہوتی تھی تو بالالتزام شیخ الاسلام حضرت اقدسؒ کے کمالاتِ روحانی کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ان تذکروں کا میرے دل پر یہ اثر مرتب ہوا کہ چند ماہ کے بعد مجھے حضرت اقدسؒ سے وہ رابطہ قلبی پیدا ہوگیا جسے عشق سے تعبیر کر سکتے ہیں، چنانچہ جب ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو اخباروں سے یہ معلوم ہوا کہ حضرتِ اقدسؒ کا وصال ہوگیا تو مجھ پر زندگی میں پہلی مرتبہ فراق کی کیفیت طاری ہوئی، میں اُس زمانے میں مسجد شاہ چراغؒ میں ہر اتوار کو مثنوی کا درس دیا کرتا تھا اور اہل علم جانتے ہیں کہ مثنوی کا سارا تار و پود عشق اور فراق انہی دو چیزوں سے مرکب ہوا ہے اور کل مثنوی ان دو ابتدائی شعروں کی تفسیر ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　از جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

یعنی روحِ انسانی جو ازل سے محبوب حقیقی کے عشق میں مبتلا تھی، جب دنیا میں آئی تو فراق کی کیفیت سے دوچار ہوگئی۔ قصہ مختصر عشق اور فراق یہ مثنوی کے دو بنیادی تصورات ہیں اور اس کا قصرِ رفیع انہی بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے محبوب سے جُدا ہوگیا ہوں۔ اللہ اکبر! یہ کتنا عظیم الشان انقلاب تھا جو میرے ضمیر کی گہرائیوں میں رونما ہوا وہ شخص جس سے مدتوں تک ن ف ر ت کرتا رہا۔ وہی شخص اب میرا محبوب بن چکا تھا اور اسی لیے اس کی وفات کی خبر پڑھ کر مجھ پر فراق کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

میں نے مثنوی کا درس ملتوی کر دیا اور مجلس میں یہ اعلان کیا کہ آئندہ مجالس میں حضرت اقدسؒ کے کمالاتِ روحانی کا بیان کروں گا، چنانچہ یہ سلسلہ چار ماہ تک جاری رہا۔ عام قارئین کی آگاہی کے لیے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت لاہوریؒ کی تلقین کی بناء پر میں نے "نقشِ حیات" اور "مکتوبات شیخ الاسلامؒ" کا مطالعہ کر لیا تھا۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک حضرت لاہوریؒ کی مجالس ذکر میں شرکت کا سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں حضرت موصوف نے اپنے ارشادات سے مجھے حضرت اقدسؒ کے مقام سے بڑی حد تک آگاہ کر دیا تھا ان ارشادات کی روشنی میں اگر ایک طرف مجھ پر حضرت اقدسؒ کے کمالات روحانی سے آگاہی حاصل ہوئی تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ حضرت اقدسؒ انگریز کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن یقین کرتے تھے۔

"خوش قسمتی سے حضرت اقدسؒ کے خلیفہ مجاز مولانا سیّد حامد میاں مدظلہ، لاہور میں سکونت پذیر ہیں، وُہ تمھارے حق میں صلاح الدّین بھی ثابت ہوں گے اور حسام الدّین بھی۔" (قاضی زاہد الحُسینی مدظلہ)

چنانچہ حضرت اقدسؒ سے تعلق کی بدولت میرے دل میں بھی انگریزی زبان، انگریزی لباس، انگریزی وضع قطع اور انگریزیت سے زندگی میں پہلی مرتبہ نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ حالانکہ میں اپنی زندگی کے ساٹھ سال اسی لعنت میں گزار چکا تھا اور اکبر کا یہ شعر مجھ پر ہو بہو صادق آتا تھا۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں　　بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

حضرت اقدسؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارا اصلی دشمن ہندو نہیں انگریز ہے، چنانچہ جب میں نے اس نگاہ سے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا تو اس ارشاد کی صداقت مجھ پر روز روشن کی طرح آشکار ہو گئی۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے اکبر الہ آبادی کو۔ انہوں نے ان شعروں میں کتنی سچی بات کہی ہے۔

زیادہ اُن سے رہو محترز کہ ہندو سے　　یہ خود ہی سوچ لو، دل میں اگر نہ کچھ کد ہو
یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف　　وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانی ہی ندارد ہو

اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تشریح سے بلاغت کا خون ہو جائے گا تو ختنے اور مسلمانی کے مفہوم اور ان دونوں میں فرق کو بھی واضح کر دیتا۔

حضرت لاہوریؒ کے وصال کے بعد زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ ذکرِ حبیب سننے کو کان ترس گئے بالآخر ۱۹۶۴ء میں محترمی قاضی زاہد الحسینی مدظلہ، کو اپنی باطنی کیفیت سے آگاہ کیا اور لکھا کہ تبریز سے جدائی کے بعد دل کسی صلاح الدین کو ڈھونڈتا ہے۔ انہوں نے ازراہِ لطف اس عاجز کو مشورہ دیا کہ "خوش قسمتی سے حضرت اقدسؒ کے خلیفہ مجاز مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہ، لاہور میں سکونت پذیر ہیں وہ تمہارے حق میں صلاح الدین بھی ثابت ہوں گے اور حسام الدین بھی"۔

چنانچہ ۱۹۶۵ء میں اس عاجز نے حضرت مدنیؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا السید حامد میاں مدظلہ، مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور سے رشتۂ ارادت و عقیدت استوار کیا اور استواری کے بعد یہ محسوس ہوا کہ نظامی مرحوم نے یہ مصرع میرے ہی لیے کہا تھا۔

ع شکر کہ جمازہ بمنزل رسید

جب میں نے اس بات کی اطلاع قاضی صاحب موصوف کو دی تو انہوں نے مجھے لکھا کہ اب جب کہ حضرت اقدسؒ کا مقام آپ پر واضح ہو چکا ہے اور آپؒ کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ گذشتہ زمانے میں آپ کے قلم اور آپ کی زبان سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدسؒ کی شان میں سرزد ہو چکی ہیں ان کا صدق دل سے اعتراف کیجیے اور توبہ نامہ شائع کیجیے تاکہ (۱) قیامت کے دن مواخذہ اور عتاب دونوں سے محفوظ ہو جائیں (۲) حضرت اقدسؒ کی توجہ اور ان کے روحانی فیض سے بہرہ ور ہو سکیں (۳) اور ان لوگوں کا بھلا ہو سکے جو عدم واقفیت کی وجہ سے آج بھی حضرت اقدسؒ کی طرف سے سوءِ ظن رکھتے ہیں جس طرح آپ خود عرصہ دراز تک اس غلطی میں مبتلا رہ چکے ہیں۔

دوسری مرتبہ ۲۰ر جنوری ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا "میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اکثر اوقات لوگ اہل اللہ کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے ہیں..... اللہ نے آپ پر خصوصی فضل فرمایا ہے۔ اگر آپ صیانۃً للناس اس موضوع پر ایک مقالہ سپردِ قلم فرما دیں جس میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ سے آپ کی نسبت کا ذکر بھی آجائے تو بڑا مفید رہے گا اور بہت سے لوگوں کا راہ نما ہو گا۔"

تیسری مرتبہ یکم اپریل ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا۔ "آج ایک بہت پاکیزہ مجلس میں آپ کا ذکرِ خیر آگیا اس لیے بطور یاد دہانی عرض ہے کہ ضرور ایک جامع مضمون اپنی انابت پر تیار فرمائیں اس سے انشاء اللہ دوسروں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"

چوتھی مرتبہ ۱۲ر اپریل ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا۔ "آپ کے اس مضمون سے انشاء اللہ کئی بھٹکے ہوئے اور گستاخ ذہن انسانوں کو نورِ ہدایت مل جائے گا اور وہ سوءِ خاتمہ سے محفوظ رہیں گے۔"

پانچویں مرتبہ اپنے ۲۴ر اپریل ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

"کلامِ اقبال کی شرح میں جہاں جہاں جناب کا قلم حدودِ ادب سے تجاوز کر گیا ہے اگر فی الحال بہت جلد ان عبارتوں سے رجوع فرمالیں تو یہ بھی صرف بہتر نہیں بلکہ ضروری ہے۔"

میں نے یہ اقتباسات قصداً درج کیے ہیں تاکہ قارئین پر یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ اس قدر تاکید کے باوجود میرا نفس اپنی گستاخیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ قارئین غور کریں کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف

نفس پر کس قدر شاق گذرتا ہے۔ قاضی صاحب مسلسل متوجہ کر رہے ہیں، مگر نفس ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا بلکہ مسلسل مجھ سے یہی کہتا رہا کہ اس اعتراف سے تیری کس قدر سُبکی ہوگی دنیا کی نظروں میں تو کس قدر ذلیل ہو جائیگا۔ وغیر ذالک من الخرافات۔

اس عرصے میں ایک دفعہ بھی میں نفس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکا یعنی اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ جب قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے میرے مقرب بارگاہ بندے کی شان میں یہ گستاخی کس بنا پر کی تھی تو کیا جواب دونگا؟ اور جب فرمائے گا کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد کیا چیز تجھ کو اعترافِ گناہ سے روکتی رہی؟ تو کیا عذر پیش کروں گا؟ اور جب بھری محفل میں یعنی اللہ کی بارگاہ میں میری رسوائی ہوگی تو کیا وہ رسوائی اس دنیا کی سُبکی یا تحقیر سے بدرجہا زیادہ نہ ہوگی!

سچ ہے ریت سے تیل نکالنا آسان ہے مگر نفس امّارہ کے پھندے سے اپنے آپ کو نکالنا بہت مشکل ہے انسان ضعیف الایمان جتنا دنیا والوں سے ڈرتا ہے اگر خدا سے اتنا ڈرنے لگے تو بلاشبہ فرشتہ بن جائے۔ سچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:

گر وزیر از خدا بترسیدے ہم چناں کز ملک، ملک بودے

جب قاضی صاحب نے دیکھا کہ میں مسلسل لیت ولعل سے کام لے رہا ہوں اور وعدوں کے باوجود ایفائے وعدہ نہیں کرتا تو انہوں نے میری عاقبت سنوارنے کے لیے اپنے دینی ترکش سے آخری تیر نکالا۔ یعنی ۲۲ مئی ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

"بہر حال آپ کی طرف سے فی الحال اگر چند سطور ہی "خدام الدین" میں آجائیں تو بہتر ہیں مثلاً شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ العزیز کی شان گرامی میں میرے قلم اور میری زبان سے جو کلمات ناشائستہ صادر ہو چکے ہیں میں ان پر صدق دل سے نادم ہو کر رجوع کرتا ہوں اس پر تفصیلی مقالے کا انتظار فرمائیں۔

یہ بھی فاستبقوا الخیرات کا مصداق ہو جائے گا۔ میں آپ سے بار بار اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ سالک کے اکثر مقامات شیخ کی شان میں بے ادبی سے نہ صرف رُک جاتے ہیں بلکہ لطائف بجھ جاتے ہیں۔"

جس وقت میں نے یہ آخری جملہ پڑھا تو مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی اُسے اس مصرع سے واضح کیا جا سکتا ہے،

ع　تزلزل در ایوانِ شیطان فتاد

دوسرے لفظوں میں اس فقرے نے میری خودی کو بیدار کر دیا، چنانچہ میں نے اپنی ہمت اور اپنے اختیار دونوں ہتھیاروں سے بیک وقت کام لے کر نفس سے کہا۔ میری ہستی عبارت ہے لطائف سے نہ کہ تجھ سے! اگر لطائف ہی بجھ گئے یعنی دل ہی مر گیا تو پھر وجودِ یوسف اور عدمِ یوسف دونوں یکساں ہو گئے! کیا تو نے اقبال کا یہ شعر نہیں پڑھا؟

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے　　　کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اے نفس! اگر میرا دل مر گیا تو پھر مجھ میں اور حمار میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ میں نے برسوں تیرا کہنا مانا، اور حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جانے کے باوجود اعترافِ گناہ نہیں کیا، لیکن اب میرے سامنے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہے اس لیے تیرا کہنا ہرگز نہیں مانوں گا' چونکہ میں اندھا تھا یعنی حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ نہ تھا اس لیے میں نے واقعی حضرت موصوفؒ کی اپنے قلم اور اپنی زبان سے ان کی شان میں گستاخیاں کی ہیں۔ میں غلط پروپاگنڈے کے سحر سے مسحور ہو گیا تھا۔ حق اور باطل میں تمیز کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ الحمدللہ کہ اُس نے مجھے قبل وفات توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی۔ چونکہ عام قارئین لطائف کے مفہوم سے آشنا نہیں ہیں اس لیے ان کے فائدے کے لیے تصوّف کی اس اصطلاح کی تشریح ذیل میں درج کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ جس طرح دماغ مرکزِ عقل ہے اسی طرح دل مرکزِ عشق ہے۔ عقل کے بارے میں تو سب متفق ہیں کہ واقعی ہر انسان میں یہ قوت (FACULTY) موجود ہوتی ہے (اِلّا ماشاء اللہ) اور یہی قوت اسے فرس و حمار سے متمیز کرتی ہے یعنی بمنزلہ فصل ہے، چنانچہ مناطقہ انسان کی تعریف ہی یہ کرتے ہیں کہ وہ حیوانِ ناطق ہے، لیکن عشق کے بارے میں اختلافِ آراء پایا جاتا ہے۔

صوفیا بخلاف عقلاء و حکماء صرف اسی کو خدا رسی کا یقینی اور محفوظ ذریعہ سمجھتے ہیں اور عقل کی عاجزی اور بے چارگی کے معترف ہیں۔

عشق کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب تو یہ ہے کہ "در گفتن نمی آید" مگر منکرین و مستفسرین کی تفہیم کے لیے مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ عشق ایک ناقابلِ بیان انجذابی کیفیت کا نام ہے۔ اس کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کی بدولت عاشق (سالک) معشوق کی صفات کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے، چنانچہ اسلام کی تاریخ میں حضرت ابوبکر الملقّب بہ صدیق

اکبر رضی اللہ عنہ سب سے بڑے عاشق گزرے ہیں جن کے سامنے سب صحابہ ایسے ہیں جیسے آفتاب کے سامنے ستارے، جن کی صرف ایک رات کی نیکیاں امیر المؤمنین حضرت عمر خطابؓ کی ساری زندگی کی نیکیوں پہ بھاری ہیں کون عمرؓ۔

وہ عمرؓ — جو

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی "مراد" ہیں۔ _____

(۲) جن کے سایے سے شیطان بھاگ جاتا تھا _____

(۳) جن کی رائے بعض معاملات میں وحی الٰہی سے موافق ثابت ہوئی _____

(۴) جنہوں نے اسلام کو آشکار کیا (مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھی) — _____

(۵) جن کی ذات سنگم تھی ان کی خسروی کا اور درویشی کا یہ عالم تھا کہ کرتے میں بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ _____

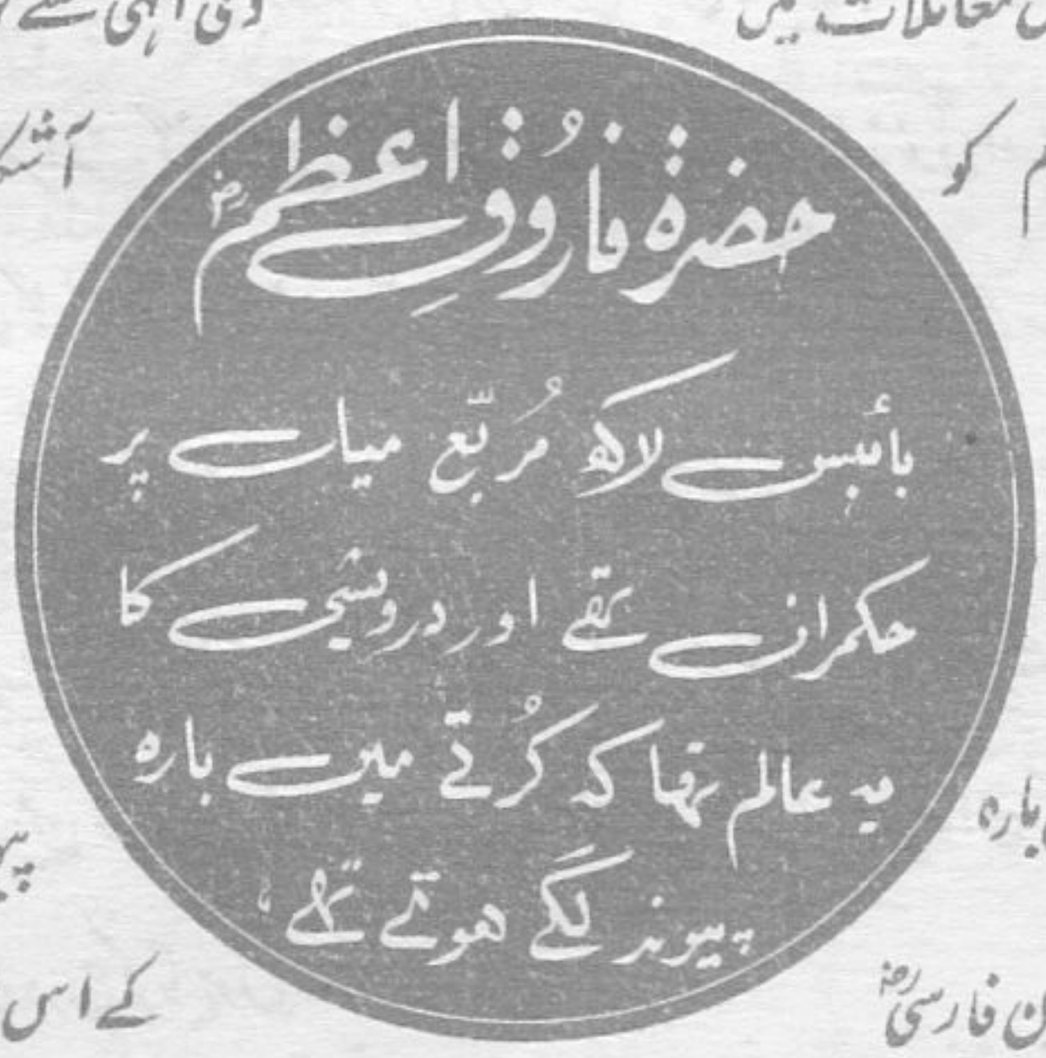

(۶) جنہوں نے سلمان فارسیؓ خسروی اور درویشی کا بہترین کے اس اعتراض پر کہ دو گز میں تمہارا کرتا کیسے بن گیا؟ فوراً اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ "جانِ پدر! اس وقت ایک صحابی رسولؐ نے مجھ پر اعتراض کیا ہے لہٰذا میری برأت کرو۔" گویا بیک وقت حریت، مساوات اور عدالت کا مظاہرہ کیا۔

(۷) جس نے چھ سو میل کا سفر اس شان سے کیا کہ نہ آج تک کسی حکمران نے کیا ہے اور نہ آئندہ کر سکے گا۔ ایک اونٹ صرف ایک اونٹ، ایک غلام جو اپنی باری پر سوار بھی ہو جاتا تھا۔ ایک مشکیزہ، ایک رکابی، ایک پیالہ، ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں اور ایک تھیلہ جس میں ستو تھے۔

(۸) جن کے بارے میں ہمارے زمانے میں نواب عماد الملک سید علی بلگرامی (شیعہ) اور موہن داس کرم چند گاندھی (ہندو) نے یہ کہا کہ "دنیا میں ابھی تک دوسرا عمرؓ پیدا نہیں ہوا ہے۔" جی ہاں وہی عمرؓ جن کی سطوت اور ہیبت کے آگے سیف من سیوف اللہ حضرت خالد جانبازؓ فاتح عراق و شام اور ممدوح عام و خاص حضرت عمرو بن عاصؓ فاتح مصر و طرابلس دونوں لرزہ براندام رہتے تھے۔

قارئین فاروق اعظمؓ کی تمام خدمات وخصوصیات کو مدّنظر رکھیں پھر اس حقیقت پر غور کریں کہ صدیق اکبرؓ کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی تو شاید "ثانی اثنین اذھما فی الغار" کے مقام کا کچھ خفیف سا اندازہ ہو سکے

ع حقیقت ابدی ہے مقام صدیقی

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ عشق وہ قوت ہے جس کے ذریعے سے عاشق معشوق کی صفات کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے اور اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ۔

مرضی او مرضی حق می شود ماہ از انگشتِ او شق می شود (اقبالؔ)

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ۔

در رضایش مرضی حق گم شود ایں سخن کے باور مردم شود (رومیؔ)

فی الجملہ یہ دل یا یہ قلب یہ گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے جسے بدلا جا سکتا ہے بلکہ یہ ایک لطیفہ ہے۔ منجملہ لطائف ستّہ۔ لطیفہ بمعنی بسیار لطیف کہ از مادہ و مادّیت وجسم وجسمانیت مطلق منزّہ باشد۔ اس کے علاوہ پانچ لطائف اور بھی ہیں۔ اگر یہ لطائف بجھ جائیں تو سالک کی ترقی ہی نہیں رک جاتی بلکہ وہ بہائم کی صف میں شامل ہو جاتا ہے یعنی جیتے جی مر جاتا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ کہ یہی ہے امّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

جب لطیفہ قلب بجھ جاتا ہے تو دوسرے لفظوں میں دل مر جاتا ہے اور اقبال اسے دل سے تعبیر نہیں کرتا بلکہ اسے "مشتِ گل" یا "راکھ کا ڈھیر" قرار دیتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ صحبت شیخ اختیار کر کے اسے دوبارہ زندہ کرو۔ دراصل انسان کا زندہ خدا کے ساتھ زندہ رابطہ اسی لطیفے کی بدولت ممکن ہو سکتا ہے اور جب تک زندہ خدا کے ساتھ

؎ یہ عاجز اس مقالے میں آپ بیتی لکھ رہا ہے۔ مگر افادۂ عام کی خاطر صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہے کہ جب تک پاکستان کے عوام اور خواص دونوں "دل" یا لطیفہ قلب کو زندہ نہیں کریں گے کسی بُرائی کا ازالہ، کسی خرابی کا قلع قمع اور کسی بدی کا دفعیہ نہیں ہو سکے گا۔ پاکستان کی بیس سال کی تاریخ میرے دعوے پر شاہد ہے۔

زندہ رابطہ استوار نہ ہو انسان کسی بدی، کسی برائی، کسی بدکاری اور کسی بدمعاشی سے باز نہیں آسکتا۔

عقل سے صرف یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اس دنیا کا بنانے والا کوئی ہے ضرور۔ یہ خود بخود تو نہیں بن گئی ہے، بس یہاں عقل کا کام ختم ہوجاتا ہے۔ لہٰذا انسان کا خدا سے رابطہ تو قائم ہوجاتا ہے، مگر وہ رابطہ زندہ یا مؤثر نہیں ہوتا یعنی اس کی بدولت زندگی میں انقلاب پیدا نہیں ہوسکتا، لیکن عشق خدا کی ہستی کا یقین[1] پیدا کر دیتا ہے اور یقین کامل کے بعد جو رابطہ پیدا ہوتا ہے وہ زندہ یا مؤثر ہوتا ہے یعنی سالک کی زندگی میں انقلاب پیدا ہوجاتا ہے۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کسی فلسفی یا منطقی نے اپنے شاگردوں کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کیا۔ یہ نعمت صرف عاشقوں کی جوتیاں سر پر رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے امیر خسرو نے سلطان جی کی جوتیاں سر پر رکھ لی تھیں۔

عام قارئین کے لیے یہ وضاحت ضروری تھی ورنہ وہ محترمی قاضی صاحب کے اس تہدیدی جملے کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ شیخ کی شان میں بے ادبی سے نہ صرف اکثر مقامات رُک جاتے ہیں بلکہ لطائف ہی بجھ جاتے ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد اب میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے وفات سے پہلے مجھے توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحب کے لیے دُعائے خیر کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے حضرت اقدسؒ کے مقام سے آگاہ فرمایا اور اس کے بعد محترم قاضی زاہد الحسینی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کارِ خیر پر آمادہ کیا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ اے اللہ! اے غافر الذنب وقابل التوب! اے غفور الرحیم!

لا الٰہ الا انت ولا قاضی الحاجات الا انت ولا غافر الذنوب الا انت ولا فاعل فی الحقیقت الا انت ولا موجود فی الحقیقت الا انت!

---

[1] اکبر الہ آبادی نے اسی نکتے کو یوں بیان کیا ہے:-

اک لطافت قلب میں تھی، عقل و حکمت کے سوا
رہ گئے سب وہ مگر پرتو ترا پا ہی گئی

یعنی عقل، حکمت، منطق، فلسفہ اور کلام یہ سارے علوم و آلات ناکام ہوگئے تیرا پرتو اگر پا سکی تو وہ لطافت جو وراء العقل تھی اور جس کا محل "قلب" ہے۔

رحیم و کریم ! میں اپنے گناہوں کا صدق دل سے اعتراف کرتا ہوں ۔ میری ساری زندگی نافرمانیوں میں بسر ہوئی ہے ۔

واپس آمد بندۂ بگریختہ آبروئے خود زعصیاں ریختہ

بے گنہ نگذشت برمن ساعتے با حضورِ دل نکردم طاعتے

اے ستار العیوب ! میں بصمیم قلب اور برگزیدہ بندے شیخ الاسلام مجاہد اعظم شیخی و سندی و وسیلتی فی الدارین سید کی شانِ اقدس میں اپنے قلم اور اپنی زبان نالائقی اور حماقت کو کسی پردے میں نہیں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں ——

اے اللہ ! میں اندھا اور جاہل تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے حرم تعلیم و تبلیغ کی اور ساری عمر اتباع رسولؐ بے خبر قرار دیتا رہا بلکہ اس کی شان میں ان گستاخیوں پر فخر کرتا رہا ——

اے اللہ ! یہاں کی ذلت

میں اسے مقام رسولؐ سے بے خبر قرار دیتا رہا جس نے حرم نبوی میں بیٹھ کر چودہ سال تک دین کی تعلیم و تبلیغ کی اور ساری عمر اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بسر کردی ۔

اقرار کرتا ہوں کہ میں نے تیرے مقبول بارگاہ قدوۃ العارفین ، زبدۃ الکاملین ، سیدی و حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ العزیز سے بڑی گستاخیاں کیں ۔ میں اپنی اس چھپانا چاہتا ۔ علانیہ صاف لفظوں میں

اور احمق اور عقل و خرد سے بیگانہ ہو گیا نبوی میں بیٹھ کر چودہ سال تک دین کی میں بسر کردی تھی اسے مقامِ رسول سے گستاخیاں کرتا رہا اور ستم بالائے ستم یہ کہ

اور رسوائی مجھے منظور ہے ۔ میں تو یوں بھی سراپا خطا اور مجسم گناہ ہوں ، مجھ میں اور ہی کون سی خوبی ہے جس پر ناز کر سکتا ہوں ۔ مجھے قیامت میں اپنی خفگی اور اپنے محبوب کی ناراضگی سے محفوظ رکھیو ۔

اے اللہ میں ڈرتا ہوں اور سخت لرزہ براندام ہوں اس بات سے کہ قیامت میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مجھ پر پڑے گی تو کہیں آنحضورؐ مجھ سے اس انداز میں خطاب نہ فرمائیں ۔ "اچھا تو تم ہو وہ گستاخ اور دریدہ دہن جس نے میرے اس عاشق صادق کی شان میں بے ادبی کی تھی جس نے میرے دین کی سربلندی کی خاطر اور میری محبت

میں ساری عمر قید و بند کو دعوت دی اور طوق و سلاسل کو لبیک کہا! جس نے میری محبت میں میرے دین کے دشمنوں کے خلاف جہاد کیا اور تادم آخر کلمۂ حق کہا، جس نے میری خاطر مالٹا میں مصائب جھیلے۔ جس نے میری محبت میں کراچی کا جیل کاٹا، جس نے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے انگریز (علیہ ماعلیہ) سے ٹکرلی۔ جس نے میری اُمّت کی بہبود کے لیے دن میں قرآن و حدیث کا درس دیا اور رات میں دشمنانِ اسلام کے خلاف لسانی جہاد کیا۔

جس نے اسلام کی خاطر غیروں کے طعنے سنے اور اپنوں سے گالیاں کھائیں اور گالیاں کھاکے بے مزہ ہونا درکنار اُن گالیاں دینے والوں کے حق میں دُعائیں کیں۔ جس نے اپنی تمام متاعِ حیات مجھ پر نثار کر دی" تو اس وقت میرا کیا حال ہوگا؟ کون سا آسمان مجھے پناہ دے گا اور کون سی زمین مجھے ٹھکانا دے گی؟

اے اللہ! حضورؐ کی ایک نگاہ عتاب میری عاقبت کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔

اے اللہ! حضورؐ کی اس نگاہِ عتاب سے بچنے کے لیے میں اس دنیا میں ہر قسم کی ذلّت اور رسوائی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

اے اللہ! میں صدق دل سے توبہ کرتا ہوں۔ میری لغزشوں، خطاؤں اور گستاخیوں کو معاف کر دے جو میں نے اپنے شیخ طریقت مخدوم ملت، محرم رازِ نبوّت، واقف اسرار رسالت اور آشنائے مقام محمدی (علیہ افضل التحیۃ والثناء) کی شان میں روا رکھی تھیں۔

اے اللہ اپنے مقبول بارگاہ بندوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ میرے حق میں معافی کے لیے دعا کریں۔ مجھے یقین ہے کہ تو ان کے وسیلے سے مجھ پر کرم کرے گا اور مجھے میرے شیخ بلکہ شیخ العرب حضرت مدنیؒ کی نسبت عالیہ سے حصہ وافر عطا فرمائے گا اور مجھے اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

ربّ تقبّل منی انك انت السمیع العلیمُ و تب
علی انّك انت التواب الرحیم وصلی
اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہٖ و
عبدہٖ و رسولہ
الکریم۔

باب دوم

مسئلۂ قومیّت پر
مولانا سیّد حُسین احمد مدنی رحمہ اللہ اور علاّمہ اقبال مرحوم
کے
اختلاف رائے کی حقیقی نوعیّت

اشعارِ اقبال اور حقیقتِ حال

تمہید

چونکہ موجودہ زمانے کے اکثر مدّاحانِ اقبال نہ تو "ارمغانِ حجاز" میں مندرجہ اشعار بعنوان "حسین احمد" کے پس منظر سے آگاہ ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ جب علامہ اقبال پر حقیقت حال منکشف ہو گئی تو انہوں نے اس امر کا اعتراف کر لیا تھا کہ "اب مجھے مولانا حسین احمد مدنی پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔"

اس لیے موجودہ اور آئندہ نسل کی آگاہی کے لیے میں اس داستان کو مفصّل طور پر سپرد قلم کر رہا ہوں تاکہ عوام اور خواص دونوں حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں گستاخی کے جرم سے محفوظ رہیں۔

مثلاً" اپریل ۱۹۶۸ء کے پاکستان ریویو میں علامہ عبدالرشید طارق نے جو مضمون اقبال اور نیشلزم کے عنوان سے سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس میں انہی اشعار کو مستدل بنا کر حضرت اقدسؒ کی شان میں وہی گستاخی کی ہے جس کا ارتکاب ۱۹۵۳ء میں میں خود کر چکا ہوں۔ محض اس لیے کہ علامہ اقبال کا اعتراف میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ علاّمہ طارق نے اس مضمون میں جو معارف بیان فرمائے ہیں ان پر بشرطِ زندگی، ایک مفصل مقالہ لکھوں گا۔ سردست صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ انہوں نے یہ شعر بھی علامہ اقبال سے منسوب فرمایا ہے۔

خود را بفریبد کہ خدا را بفریبد   آں شیخ فرومایہ کہ خود را مدنی خواند

علّامہ اقبال کی خدمت میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مجھے بھی ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء قریب تیرہ سال تک حاضر ہونے کا موقع ملا۔ ایک آدمی کی ذہنیت اور سیرت کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ مدّت کافی سے زیادہ ہے۔ میرا دل نہیں مانتا کہ علامہ اقبال مرحوم اخلاقی اعتبار سے اتنے پست (فرومایہ) تھے کہ ایک مشہور و معروف عالمِ دین، شیخ الہند کے جانشین، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، لاکھوں مسلمانوں کے روحانی پیشوا اور لاکھوں سرفروشوں کے سیاسی رہنما جس کے قدموں کو ۱۹۲۱ء میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جنت آشیانی نے بھری عدالت میں بوسہ دیا تھا جس نے ساری عمر ملاعنہ فرنگ کے خلاف جہاد کیا، جس نے ساری عمر کلمۂ حق کہا، جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں۔ جس کی عظمت پر آج بھی مالٹا گواہی دے رہا ہے۔ کراچی، نینی، بریلی، فیض آباد، مراد آباد اور خدا معلوم کتنے شہروں کی جیلیں آج بھی اس کی آہِ سحر گاہی اور قرآن الفجر کی برکات سے مالا مال ہیں، جس نے ایک دو نہیں پورے چودہ سال تک حرم نبوی میں حدیثِ نبوی کا درس دیا۔

گردن نہ جھکی جس کی کسی شاہ کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے مُردوں میں پڑی جان

جس کی علو ہمّت کا یہ عالم تھا کہ اس نے ملاعنہ فرنگ کے خطابات درکنار، خود حکومتِ ہند کے خطاب (پدم بھوشن) اور طلائی تمغے دونوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں نے اپنے وطن کو کسی خطاب یا جاگیر حاصل کرنے کی نیت سے آزاد نہیں کرایا بلکہ اپنا فرض ادا کیا، انگریز میرا دشمن تھا، میرے وطن کا دشمن تھا اور سب سے بڑھ کر میرے دین کا دشمن تھا اس لیے اُسے ختم کرنا میرا دینی فریضہ تھا۔

ایسے شخص کے لیے اقبالؒ ایسا ناروا لفظ استعمال کرتے؟ اقبال فارسی دان تھے۔ اس لیے اس لفظ کے (CONNOTATION) مفہوم سے واقف تھے اور خود بہت شریف آدمی تھے اور شریف کی پہچان یہ ہے کہ وہ دوسروں کی توہین نہیں کیا کرتا۔ دشنام طرازی شریفوں کا شیوہ کبھی نہیں رہا۔

رہا خود را مدنی خواند والا فقرہ، تو یہ بھی اقبال کے قلم سے نہیں نکل سکتا، کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ حضرت اقدس ساری عمر اپنے نام سے پہلے "ننگ اسلاف" لکھتے رہے۔ ان کے ہزاروں خطوط آج بھی اُن کے شاگردوں، مریدوں، عقیدت مندوں اور مداحوں کے پاس موجود ہیں۔ کسی خط میں حضرت نے اپنے اسم گرامی کے ساتھ لفظ "مدنی" کا اضافہ نہیں فرمایا لہٰذا "خود را مدنی خواند" خلاف حقیقت ہے یعنی دروغ بے فروغ ہے اور اقبال اس جرم کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت اقدس کے

عشاق اور تلامذہ محض اظہارِ حقیقت کے طور پر آں جنابؒ کو مدنی کے لقب سے یاد کرتے تھے اور آج بھی یاد کرتے ہیں اور بجا طور پر کیونکہ حضرت اقدسؒ کی زندگی کا بڑا حصہ مدینۃ النبیؐ میں بسر ہوا۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یہ تو حضرت اقدس کی روحانی عظمت کی دلیل ہے کہ آپ خود ساری عمر اپنے آپ کو "ننگ اسلاف" لکھتے رہے اور دنیا آپ کو "مدنی" کہتی رہی اور انشاء اللہ کہتی رہے گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام شیخ[1]

قارئینِ کرام سے اس اعراض عن الموضوع کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ سطور بے اختیار نوکِ قلم پر آ گئیں۔ بعض اوقات ایسے مواقع پیش آ جاتے ہیں کہ دل پر اختیار باقی نہیں رہتا۔ اب میں اس واقعہ کی تفصیل سپردِ قلم کرتا ہوں۔ یعنی ع

دگر از سر بگیرم قصۂ زلفِ پریشاں را

---

۸ رجنوری ۱۹۳۸ء کی شب میں حضرت اقدس مولانا مدنیؒ نے صدر بازار دہلی متصل پل بنگش ایک جلسے میں ایک تقریر فرمائی جس کا بڑا حصہ ۹ رجنوری کے "تیج" اور "انصاری" دہلی میں شائع ہوا۔ چند روز کے بعد "الامان" اور "وحدت" دہلی نے اس تقریر کو قطع و برید کے بعد اپنے صفحات میں جگہ دی۔ ان پرچوں سے "زمیندار" اور "انقلاب" لاہور نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرتِ اقدسؒ کی طرف منسوب کر دیئے کہ حسین احمد دیوبندی نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں بنتیں، اس لیے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔ او کما قال

جب یہ اخباری اطلاع علامہ اقبال کے کان میں پڑی تو انہوں نے حضرت اقدسؒ سے استفسار یا تحقیق کیے بغیر یہ تین اشعار سپردِ قلم کر دیئے۔

---

[1] اشارہ بجانب شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ العزیز۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد، ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار کی بنا پر ہندوستان کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جس کی تفصیل اس زمانے کے روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں سے معلوم ہوسکتی ہے۔

خوش قسمتی سے ایک دردمند مسلمان نے جنہوں نے مصلحتاً "طالوت" کا نام اختیار کرلیا تھا حقیقت حال دریافت کرنے کے لیے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس کے جواب میں حضرتِ موصوفؒ نے یہ خط انہیں لکھا:۔

حضرتِ مدنیؒ کا خط طالوت کے نام

محترم المقام، زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاجِ مبارک۔

والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا۔ میں آپ کی محبت کا شکرگزار ہوں، بالخصوص اس بناء پر کہ باوجود عدم ملاقات اس قدر التفات فرماتے ہیں۔ میرے پاس بہت سے خطوط اس کے متعلق آئے، مگر میں انتہائی درجے میں عدیم الفرصت ہوں اور اس قسم کے افترآت اور سبّ وشتم کا سیلاب کم وبیش اس زمانے سے جبکہ میں نے تحریکات وطنیہ اور ملّیہ میں قدم اٹھایا ہے، برابر جاری ہے۔ اس لیے ایسی باتوں میں وقت صرف کرنا اضاعتِ وقت سمجھتا ہوں اور واذا خاطبھم الجاھلون الآیۃ پر عمل پیرا رہتا ہوں۔ میں اس وقت بھی چپ تھا مگر آپ کے والا نامے نے مجبور کیا کہ حقیقت واضح کی جائے اس لیے باوجود عدیم الفرصتی مختلف اوقات میں لکھ کر مندرجہ ذیل مضمون پیش کرتا ہوں۔

"اصل واقعہ یہ ہے کہ صدر بازار دہلی متصل پل بنگش زیرِ صدارت مولانا نورالدین صاحب، جلسہ کیا گیا تھا، اس میں اہلِ محلہ کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس میں میری ملّی اور وطنی خدمات کو سراہا گیا، جلسہ نہ وعظ ونصیحت کا تھا اور نہ اسلامی تعلیمات کے بیان کرنے کا، ایک روز صبح کو ایک مذہبی جلسہ ہوچکا تھا۔ شب کے جلسے کے اعلان میں یہ طبع کیا جاچکا تھا کہ حسین احمد کو ایڈریس پیش کیا جائے گا۔ ایڈریس کے اس جلسے میں لیگیوں اور بالخصوص مولوی مظہرالدین صاحب اور ان کے ہمنواؤں میں انتہائی غصّہ پھیلا ہوا تھا۔ کوشش کی جارہی تھی کہ جلسہ کو درہم برہم کیا جائے۔ جس کا احساس

کر کے جنابِ صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ اس جلسے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے متعلق کوئی تقریر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد میں ایڈریس کا جواب دینے کے لیے کھڑا ہوا۔ میں نے بعض ضروری مضامین کے بعد ملک کی حالت، بیرونی ممالک اور غیر اقوام، نیز اندرونِ ملک میں آزادی کا تمہیدی مضمون شروع کیا تو کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ دیکھو! انگلستان کے بسنے والے سب ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں، نصرانی بھی، پروٹسٹنٹ بھی ہیں کیتھولک بھی، یہی حال امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ کا ہے۔ جو لوگ جلسے کو درہم برہم کرنے آئے تھے انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ میں اسوقت یہ نہ سمجھ سکا کہ شور کی وجہ کیا ہے۔ غلبہ جاری رکھنے والے لوگ اور وہ چند آدمی جو شور و غوغا چاہتے تھے، سوال و جواب دیتے رہے اور چُپ رہو کے الفاظ سنائی دیئے۔ اگلے روز "الامان" وغیرہ میں چھپا کہ حسین احمد نے تقریر میں یہ کہا کہ قومیت وطن سے ہوتی ہے مذہب سے نہیں ہوتی اور اس پر شور و غوغا ہوا۔ اس کے بعد اس "الامان" میں اور دیگر اخبارات میں سبّ و شتم چھاپا گیا۔ کلام کے ابتدا اور انتہا کو حذف کر دیا گیا اور کوشش کی گئی کہ عام مسلمانوں کو ورغلایا جائے۔ میں اس تحریف و اتہام کو دیکھ کر چپکا ہو گیا، تقریر کا بڑا حصہ "انصاری" اور "تیج" میں بھی چھپا، مگر اس کو کسی نے نہیں لیا۔ "الامان" اور "وحدت" سے "انقلاب" اور "زمیندار" نے لیا اور اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالی۔ ۹ر جنوری کے "انصاری" اور "تیج" کو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب و ملّت کا دار و مدار وطنیت پر ہے۔ یہ بالکل افتراء اور دجل ہے۔ "احسان" مورخہ ۳۱ر جنوری کے صفحہ ۳ پر بھی میرا قول یہ نہیں بتایا گیا۔ بلکہ یہ کہا گیا کہ قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی غلط ہے مگر یہ ضرور تسلیم کیا گیا ہے کہ مذہب و ملّت کا مدار وطنیت پر ہونا میں نے نہیں کہا تھا۔

شملے کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والے ایسے افتراء کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس قسم کی تحریفیں اور سبّ و شتم ان کے فرائض میں سے ہیں، مگر سر اقبال جیسے مہذب اور متین شخص کا اُن کی صف میں آجانا ضرور تعجب خیز امر ہے۔ اُن سے میری خط و کتابت نہیں۔ مجھ جیسے ادنیٰ ہندوستانی کا ان کی بارگاہِ عالی تک پہنچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اگر غیر مناسب نہ ہو تو ان کی بارگاہِ عالی میں یہ شعر ضرور پہنچا دیجیے۔

هنیئاً مریئاً غیر داءٍ مخامرٍ لعزة من اعراضنا ما استحلت

افسوس کہ سمجھ دار اشخاص اور آپ جیسے عالی خیال تو یہ جانتے ہیں کہ مخالفت کی بنا پر یہ اخبار ہر قسم کی ناجائز اور نامنزا کار روائیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان پر ہرگز اعتماد ایسے امور پر نہ کرنا چاہیے اور سر اقبال جیسے عالی خیال اور حوصلہ مند، مذہب میں ڈوبے ہوئے تجربہ کار شخص کو یہ خیال نہ آیا۔ نہ تحقیق کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ آیت اذا جاء کم فاسق بنبإٍ فتبینوا (الایہ) گویا ان کی نظر سے نہیں گزری۔ سر اقبال فرماتے ہیں:

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ملت اور قوم کو سر اقبال ایک قرار دے کر ملت کو وطنیت کی بناء پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیت کو بھی اس سے منزہ قرار دیدیتے ہیں۔ یہ بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے؟ زبان عربی اور مقام محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے کون بے خبر ہے؟ ذرہ غور فرمائیے۔ میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیت کا کہا ہے، ملّت کا نہیں کہا ہے۔ دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ملت کے معنی شریعت اور دین کے ہیں اور قوم کے معنی مردوں اور عورتوں کی جماعت کے ہیں۔ قاموس میں ہے: "وبالکسر الشریعۃ او الدین"۔ یہ ملّت کی بحث میں ہے۔ نیز قاموس میں ہے۔ القوم الجماعۃ وتدخلہ النساء تبعیۃ۔ (بحث قوم)

مجمع البحار میں ملّت کے معنی ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں:

"ما شرع اللہ لعبادہٖ علی السنۃ الانبیاء ویستعمل فی جملۃ الشرائع لا فی احادھا ثم اتسعت فاستعملت فی الملۃ الباطلۃ فقیل الکفر ملۃٌ واحدۃٌ"۔

میں نہیں سمجھ سکتا یہ منطق کون سی ہے؟ الفاظ قوم، ملّت، دین تینوں عربی ہیں۔ ان کے معانی کو لغتِ عربی سے پوچھیے اور دیکھیے کہ کسی عربی لغت میں قوم اور علی ہذا القیاس قوم اور دین کو مرادف اور ہم معنی قرار دیا ہے یا نہیں۔ آیات اور روایات کو ٹٹولیے اور سر صاحب کی بوالعجبی کی داد دیجیے۔

اگر میری تقریر کے سیاق و سباق کو بھی حذف کر دیا جائے اور عبارت میں حسبِ اعلان جریدہ "احسان" "قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے" بتائی جائے تب بھی میں نے کب کہا کہ ملت یا دین کی اساس

وطن پر ہے ؟ پھر سر موصوف کی یہ نسبت "سرود بر سر منبر الخ" افترا محض نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور ان کا ان تینوں لفظوں کو ایک قرار دینا عجیبت اور زبان عربی سے ناواقفیت نہیں تو اور کیا ہے ؟

آپ مجھ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ تو اپنے خیالات سے مجھ کو مطلع کر ۔ جواباً عرض ہے کہ قوم کا لفظ ایسی جماعت پر اطلاق کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت کی موجود ہو، خواہ وہ مذہبیت ہو یا وطنیت یا نسل یا زبان یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفت مادی یا معنوی کہا جاتا ہے، عربی قوم، عجمی قوم، ایرانی قوم، مصری قوم، پختون قوم، سیدوں کی قوم، شیخوں کی قوم، کنجڑوں کی قوم، موچیوں کی قوم، کالوں کی قوم، گوروں کی قوم، صوفیوں کی قوم وغیرہ وغیرہ ۔ یہ محاورات تمام دنیا میں شائع ہیں اور زبان عربی بلکہ آیات و احادیث میں بکثرت وجوہ پر اطلاق لفظ قوم کا پایا جاتا ہے ۔ انہی میں ہندوستانی قوم بھی ہے ۔ موجودہ زمانے میں ہندوستانی قوم سے بیرونی ممالک میں تمام باشندگان ہندوستان سمجھے جاتے ہیں خواہ اردو بولنے والے ہوں یا بنگلہ، خواہ کالے ہوں یا گورے، ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا سکھ، انڈین کا لفظ ہر ہندوستانی پر اطلاق کیا جاتا ہے ۔ میں ہندوستان سے باہر تقریباً سترہ برس رہا ہوں ۔ عرب، شام، فلسطین، افریقہ، مصر، مالٹا وغیرہ میں رہنا ہوا ۔ ہر ملک کے باشندوں سے ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا ہوا ۔ جرمن، آسٹرین، بلگیرین، انگریز، فرانسیسی، آسٹریلین، امریکی، روسی، چینی، جاپانی ترکی، عربی وغیرہ مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ سالہا سال ملنا جلنا اور نشست و برخاست کی نوبت آئی ۔ اگر یہ لوگ عربی یا ترکی یا فارسی یا اردو سے واقف ہوتے تھے تو بلا ترجمان ورنہ بذریعہ ترجمان گفتگو ہوتی تھی ۔ سیاسی مسائل اور مذہبی امور زیرِ بحث رہتے تھے ۔ میں نے بیرونی ممالک کے عام لوگوں کو اسی خیال اور عقیدے پر پایا کہ ——— وہ ہندوستانی لوگوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں اور سب کو باوجود مختلف المذاہب، مختلف اللسان و الالوان ہونے کے ایک ہی لڑی میں پروتے ہیں ۔ لغوی معنی اس سے انکاری نہیں عرف اس کا متقاضی ہے ۔ پھر اس کے انکار کے کیا معنی ہیں ؟ یہ دعوے کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد، جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی یا اخوتِ بشری پر رکھتی ہے (جیسا کہ مدیر "احسان" کا دعویٰ ہے) مجھے نہیں معلوم کہ نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے، جس کی بنا پر اختلاف اوطان وغیرہ پر اطلاق لفظ قوم ممنوع ہو ۔ لوگوں میں مساویانہ برتاؤ اور برادرانہ معاملات دوسری چیز ہیں حالانکہ ان میں امتیاز عرفاً و شرعاً معتبر

ہے۔ اس کے علاوہ تقریر میں تو اسلامی تعلیم اور نظریہ کا کوئی ذکر بھی نہیں تھا۔

میرے محترم اس اجنبی اور خود غرض حکومت اور خون چوسنے والی قوم نے جس قعرِ مذلّت اور ہلاکت اور قحط و افلاس کے تیرہ و تار گڑھے میں تمام ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً عرصۂ دراز سے ڈال رکھا ہے اور جس طرح وہ ہندوستانیوں کو روز افزوں فنا کے گھاٹ اتارتی جا رہی ہے وہ اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔ نیز اس سے آزاد ہونا اور ملک و ملت کی زندگی اور بہبودی کی فکر اور سعی کرنا ہر حیثیت سے سبھوں کا فریضہ ہونا بھی اظہر من الشمس ہے (ان دونوں چیزوں سے بجز غبی یا مکابر کوئی شخص بھی منکر نہیں ہو سکتا) اگرچہ اس پردیسی خونخوار قوم سے نجات کے اور ذرائع بھی عقلاً ممکن ہیں، مگر جس قدر قوی اور مؤثر ذریعہ تمام ہندوستانیوں کا متفق اور متحد ہو جانا ہے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے آگے، اس حکومت کے جملہ اسلحہ اور تمام قوتیں بیکار ہیں اور بغیر نقصانِ عظیم ہندوستانی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز "متحدہ قومیت" کے نہیں جس کی اساس وطنیت ہی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگرس نے ابتداء ہی سے اس امر کو اپنے اغراض و مقاصد میں داخل کیا ہے۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں جبکہ کانگرس کا پہلا اجلاس ہوا تو سب سے پہلا مقصد مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ "ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے، ان سب کو متفق اور متحد کر کے ایک قوم بنایا جائے۔"

یہی متحدہ قومیت انگلستان کے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتی رہی ہے اور ہر انگریز اس سے خائف اور اس کے زائل کرنے کے لیے ہر طرح سے ساعی ہے۔ پروفیسر سیلے نے (EXPANSION OF ENGLAND) میں اس کے متعلق یہ لکھا ہے۔

"اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح بھی نہ ہو، بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحادِ عمل ہندوستانیوں کے لیے شرمناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا، کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور نہ اس پر فاتحانہ حکمرانی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اسی طرح کی حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً

برباد ہو جائیں گے۔"

اسی بناء پر ہمیشہ سے یہی کوشش مدبّران برطانیہ کی جاری رہی ہے کہ یہ جذبہ ہندوستانیوں میں پیدا ہونے دیا جائے۔ اور اگر کبھی کوئی صورت اس کی پیش آ بھی جائے تو اسکو جلد از جلد ہر ممکن صورت سے تفرقہ ڈلوا کر فنا کر دیا جائے۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی انگریزی پالیسی مشہور اور مشاہد ہے۔ بالخصوص کانگرس کے پیدا ہونے کے بعد تو اس راہ میں انتہائی جدوجہد جاری ہے۔ مسٹر بیک اور مسٹر مارلیسن اور سر آکلینڈ کالون کی انتہائی انفرادی مساعی اور پھر ۱۸۸۸ء میں اجتماعی مساعی اسکی شاہد عدل ہیں جس کے ماتحت اولاً اسی سنہ میں "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قائم کرائی گئی جس کا دوسرا نام "اینٹی کانگرس ایسوسی ایشن" تھا۔ پھر ۱۸۹۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا تخلیق کی گئی جس کے مقاصد حسبِ ذیل قرار دیئے گئے تھے۔

(۱) مسلمانوں کی رائیں انگریزوں اور گورنمنٹ ہند کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(۲) عام سیاسی شورش کو مسلمانوں میں پھیلنے سے روکنا۔

(۳) ان تدابیر میں امداد دینا جو سلطنت برطانیہ کے استحکام اور اس کی حفاظت میں معاون ہوں۔ ہندوستان میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور لوگوں میں وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔

مسٹر بیک اور مسٹر کالون وغیرہ کی انفرادی مساعی کا یہ نتیجہ تھا کہ سرسیّد جیسے تیز اور سخت سیاسی آدمی کے خیالات پر نہایت زہریلا اثر ڈالا گیا۔ "اسبابِ بغاوت ہند" کے لکھنے والے شخص کے عقائد اور ارادوں کو پیہم مساعی سے بالکل ہی جامد اور انگریز پرست اور ڈرپوک بنا دیا گیا ....

مسلمانوں کو ہمیشہ دھوکا دیا گیا اور آج بھی نہایت قوت اور چالاکی سے دیا جا رہا ہے۔ ان کو چاہیئے کہ گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کریں اور اپنے تحفظ و زندگی کا سامان کریں۔ اہلِ مطالعہ سے میری پُرزور درخواست ہے کہ وہ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" یہ کتاب جو ابھی ابھی مطبع نظامی بدایوں سے چھپی ہے کا بغور مطالعہ فرمائیں۔

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۸ ذی الحجہ ۵۶ھ

حضرتِ مدنیؒ کا دوسرا خط جنابِ طالوت کے نام

"محترم المقام ، زید مجدکم ، السلام علیکم ، مزاج شریف

والا نامہ مجھ کو کلکتہ میں ۲۴ ذی الحجہ کو ملا۔ میرے محترم! سرِ موصوف کا ارشاد ہے کہ اگر بیانِ واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلافِ دیانت ہے۔ اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ الفاظ پر پھر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے سابق و لاحق پر بھی نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے میں جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا کہ تم کو ایسا کرنا چاہیئے (یعنی) خبر ہے انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا۔ نہ امر و انشا کا لفظ ذکر کیا ہے۔ پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے! واقعہ اصلی یہ تھا کہ میں تقریر میں ان امور کو گنوا رہا تھا جو ہندوستانیوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص انگریزوں سے ہندوستان میں پہنچے ہیں۔ ان میں پہلی چیز ذکر میں ذلت آئی تھی کہ اس وقت ہم تمام دنیا میں ذلیل شمار کیے جاتے ہیں کیونکہ ساری دنیا کا خیال ہے کہ ہندوستانی (ہندوستان کے باشندے) ایک قوم ہیں اور وہ سب کے سب غلام ہیں اور غلام ذلیل و خوار ہوتا ہی ہے۔ اس لیے ہم بیرونی ممالک میں نہایت ذلیل دیکھے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، یہودی وغیرہ کا مذہبی یا نسلی یا صفتی فرق نہیں دیکھتے۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کے متعلق نٹال، ٹرانسوالی، زنجبار، کیپ کالونی، ماریشس، نیروبی، کینیا، فجی، آسٹریلیا، کناڈا اور امریکہ وغیرہ نہایت شرمناک اور ذلیل ترین قوانین اپنے یہاں بناتے ہیں اور ہندوستانی باشندوں کو شہری حقوق سے محروم کرتے ہیں اور ہم وہاں کے ہندوستانی باشندوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیا وہ یہ سلوک جاپان یا چین یا اطالین یا انگلینڈ یا ڈچ وغیرہ آزاد قوموں کے ساتھ کر سکتے ہیں؟ اسی طرح ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے متعلق جو فلسطین، مصر، سیریا، عراق، طرابلس یا الجیریا میں موجود ہیں آوازیں اٹھاتے ہیں، مگر کوئی یورپین طاقت ہماری آواز کی طرف رُخ نہیں کرتی اور نہ متاثر ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ذلّت ہے۔ خود برطانیہ کے مقابل پر ہم اس کے کھلے ہُوئے مظالم پر جو ہندوستان اور سرحد میں ہو رہے ہیں پروٹسٹ کرتے ہیں، مگر وہ کان بھی نہیں دھرتی۔

دوسری چیز مَیں نے ذکر کی تھی، بُزدلی اور جُبن۔ تیسری چیز نفاق، چوتھی چیز فقر و فاقہ، پانچویں چیز جہالت چھٹی چیز کسل اور سستی، ساتویں چیز بدعقلی، آٹھویں بیکاری وغیرہ، مسلمانوں کے لیے خصوصی دارالاسلام کا دارالحرب ہوجانا، عالم اسلامی کا اس غلامی کی وجہ سے برباد ہونا، مذہبی امور کا غارت ہونا وغیرہ، یہاں کوئی مشورہ بجز اس کے ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ اشد ضروری ہے کہ جلد از جلد کوشش کر کے ہندوستان کو آزاد کرائیں اگر اس مشورے کو خلافِ دین و امانت شمار کیا جاتا ہے تو علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں اس کو فرض سمجھتا ہوں۔ فذالك ذنبٌ لست منه التوب - (یہ ایسا گناہ ہے جس سے میں توبہ نہیں کرسکتا) دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے یہ مشورہ دوں گا اور میرا اعتقاد ہے کہ اس میں تقصیر کرنا مسلمان کے لیے حرام ہے اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لینا ضروری ہے۔

باقی رہا ملّت اسلامی کا بلا انساب، بلا اوطان، بلا الوان، بلا صنائع وغیرہ متحد ہونا اور کرنا تو یہ دوسرا امر ہے۔ اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ اس کی بنا پر ہم مالٹا میں قید رہے۔ ہم نے کراچی کا جیل کا ٹا اور سینکڑوں مصائب اٹھائے اور بچپن سے اس کی تعلیم پائی اور قرآن کی آیات، احادیثِ صحیحہ اور روایات آج نہ سطور میں بلکہ صدور میں موجود ہیں۔ جن کو بارہا منابر پر مجامع میں ہم پڑھتے ہیں اور اس کا وعظ سناتے ہیں کوئی تو صرف اس کا قوال ہی ہوگا۔ ہم قوال اور فعال دونوں ہیں۔ قوم کی بے حسی اور کمزوری کی وجہ سے اس حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ قوم اور ملت اور دین کو ایک قرار دیا گیا۔ میں فرق کو پہلے خط میں نقل کر چکا ہوں اگر خلاف لغت سر صاحب موصوف کا نظریہ دونوں کے اتحاد کا ہے تو ان کو اپنے نظریے کے مخالف کو ایسے ناشائستہ الفاظ کہنے کا کیا حق تھا۔ بہرحال۔

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

میرے محترم! ہم تو ایسے سبّ و شتم کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لیے سن کر کوئی تغیّر نہیں ہوتا:

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب سے علیحدہ ہوا ہوں، ہر قسم کے سبّ و شتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوا ہوں۔ وہ کون سے الفاظ اور معاملات ہیں جو نہیں کیے گئے۔ سر موصوف صاحب تو پھر بھی غیر ہیں۔ یہاں اپنے ہی کیا کمی کر رہے ہیں۔

والسّلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۲۵ر ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ

جنابِ طالوت کا خط علّامہ اقبال کے نام

مناع محترم اسلامیاں السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ

اگرچہ میرا یہ درجہ نہیں کہ آپ سے شرف مخاطبت حاصل کر سکوں مگر "الضرورات تبیح المحذورات" کی بناء پر باوجود اس علم کے کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز رہتی ہے، تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں۔

مولانا حسین احمد صاحب قبلہ کے متعلق آپ کی نظم "عجم ہنوز نداند الخ" روزنامہ احسان میں چھپی اور اس سے پہلے احسان، زمیندار اور انقلاب میں ان کے خلاف متواتر پروپاگنڈا بھی کیا جاتا رہا۔ میں نے مولانا کو ایک نیاز نامہ میں اس نظم اور پروپاگنڈے کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے جواب میں انہوں نے ازراہِ شفقت ایک مفصل تحریر بھی بھیجی ہے جس کے اہم اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(نوٹ: طالوت صاحب نے مذکورہ بالا خطوں کے جو اہم اقتباسات درج کئے ہیں انہیں بخوفِ طوالت و تکرار حذف کر رہا ہوں۔)

یہ مولانا کی تقریر کے وہ اقتباسات ہیں جو میرے نزدیک ضروری تھے کہ آپ کی نظر سے گزر جائیں جہاں تک میرا خیال ہے مولانا کی پوزیشن صاف ہے۔ آپ کی نظم کی اساس غلط پروپاگنڈے پر ہے اس لیے آپ کے نزدیک بھی اگر مولانا بے قصور ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی عالی ظرفی کی بنا پر اخبارات میں ان کی پوزیشن صاف فرمائیے۔ بصورت دیگر مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمائیے تاکہ مولانا سے مزید تسلی کر لی جائے۔ ہمارے جیسے نیازمند جو دونوں حضرات کے عقیدت کیش ہیں، دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا ہیں۔ امید ہے کہ عدیم الفرصتی کے باوجود آپ ہمیں اس ورطۂ حیرانی سے نکالنے میں آیۂ رحمت ثابت ہوں گے۔

"طالوت"

علّامہ اقبال کا خط جنابِ طالوت کے نام

۱۶ر فروری سنہ ۱۹۳۸ء

جناب من ۔ مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے ہیں ان میں سے بعض میں تو اصل معاملہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، مگر بعض نے ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کو بھی اس ضمن میں خطوط لکھے ہیں، چنانچہ آپ کے خط میں مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج ہیں۔ اس لیے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کے لیے انتخاب کیا ہے۔ جواب انشاءاللہ اخبار "احسان" میں شائع ہوگا۔ میں فرداً فرداً علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں۔

مخلص محمد اقبال

علّامہ اقبال کا دوسرا خط جنابِ طالوت کے نام

۱۸ر فروری سنہ ۱۹۳۸ء

جنابِ من سلام مسنون ۔ میں حسب وعدہ آپ کے خط کا جواب "احسان" میں لکھوانے کو تھا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی جس کا گوش گزار کرنا ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ مولوی صاحب کو خط لکھ کر اس بات کو صاف کر دیں گے جو اقتباسات آپ نے اُن کے خط سے درج کیے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ:

"آجکل قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" اگر اُن کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے، البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کر لیں تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، کیونکہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی؟ اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہونے پائے اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصود ان الفاظ سے کیا تھا؟ مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلائیے کہ میں اُن کے احترام میں کسی مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں . . . .

مخلص محمد اقبال

علّامہ اقبال مرحوم کا تردیدی بیان

جو روزنامہ احسان لاہور مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہُوا

"میں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا۔"

(حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بیان)

"مجھے اس اعتراف کے بعد ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔"

(علامہ اقبال کا مکتوب)

قومیّت و وطنیّت کے مسئلہ پر ایک علمی بحث کا خوشگوار خاتمہ

جناب ایڈیٹر صاحب "احسان" لاہور السلام علیکم

میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے اس میں مَیں نے اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد۔ "زمانہ حال میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں" محض بر سبیل تذکرہ ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور اگر مولانا نے مسلمانانِ ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریہ قومیت کا اختیار کر لیں تو دینی پہلو سے مجھے اس پر اعتراض ہے۔

مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار "انصاری" میں شائع ہوا ہے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

لہٰذا ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور انکو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتہ اتحاد بجز قومیت اور کوئی رشتہ نہیں جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے۔"

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار احسان میں شائع ہُوا ہے، لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا جس کی ایک نقل انہوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے۔ اس خط میں مولانا

ارشاد فرماتے ہیں:

"میرے محترم سرصاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں ہے اور اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈالی جائے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ خبر ہے، انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا۔ پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے۔"

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے ان عقیدتمندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں۔ جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدائے تعالےٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید فرمائے۔ نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں، میں ان کے کسی عقیدتمند سے پیچھے نہیں ہوں۔"

(محمد اقبال)

حرفِ آخر

الحمد للہ کہ میں نے اس زمانے کے عقیدت مندانِ اقبال کی آگاہی کے لیے اس صداقت کو دوبارہ واضح کر دیا کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد علامہ اقبال نے اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا اور وہ اشعار محض اس لیے ارمغان حجاز میں راہ پا گئے کہ اس اعتراف کے صرف تین ہفتوں کے بعد علامہ وفات پا گئے اور انہیں یہ ہدایت دینے کا موقع نہ مل سکا کہ ان اشعار کو ارمغان حجاز میں شامل نہ کیا جائے۔ اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ ارمغان حجاز میں اس نظم کے ساتھ یہ صراحت کر دی جائے کہ حقیقت حال سے

آگاہ ہونے کے بعد علّامہ مرحوم نے ان اشعار کو کالعدم قرار دے دیا تھا تو بہت اچھا ہو، کیونکہ اس تصریح کی بدولت قارئین حضرتِ اقدسؒ کے خلاف سوءِ ظن سے محفوظ ہو جائیں گے۔

اس سلسلے میں مَیں قارئین کی توجہ اس خطبۂ صدارت کے حسبِ ذیل فقرے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جو بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مجلس دستور ساز کے سامنے دیا تھا: یعنی

"YOU MAY BELONG TO ANY RELIGION OR CASTE ORCREED THAT HAS NOHING TO DO WITH THE BUSINESS OFTHE STATE_YOU WILL FIND THAT IN COURSE OF TIME HINDUS WOULD CEASE TO BE HINDUS AND MULIMS WOULD CEASE TO BE MUSLIMS NOT IN THE RELI GIOUS SENSE, BECAUSE THAT IS THE PERSONAL FAITH OF EACH INDIVIDUAL BUT IN THE POLITICAL SENSE AT CITIZENS OF THE STATE"

(QUAID-I-AZAM SPEAKS- PAK PUBLICITY KARACHI, 10-11)

ہم بشرط انصاف قارئین کرام سے سوال کرتے ہیں کہ کیا تحریک مسلم لیگ کے قائداعظم اور بانیٔ پاکستان کے مندرجہ بالا الفاظ جو انہوں نے انتہائی ذمہ دارانہ حیثیت میں ارشاد فرمائے تھے۔ مجاہد حریت حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ کے نظریات سے کسی درجے میں بھی مختلف ہیں؟

بیّنوا توجروا۔